الرسالہ

Al-Risāla

August 2000 • No. 285 • Rs. 10

ہر آدمی آخر کار حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو مجبوری پیش آنے سے پہلے حقیقت کا اعتراف کرلے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	عظمتِ مومن	7.00	دعوت اسلام	50.00
مطالعۂ سیرت	60.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00	دعوت حق	40.00
اسباق تاریخ	85.00	تاریخ دعوت حق	5.00	نشری تقریریں	80.00
تعمیر حیات	60.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	دین انسانیت	60.00
تعمیر انسانیت	50.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	فکر اسلامی	50.00
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم	125.00	کتاب زندگی	65.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	اقوالِ حکمت	25.00	طلاق اسلام میں	5.00
اللہ اکبر	45.00	تعمیر کی طرف	8.00	مضامین اسلام	60.00
پیغمبر انقلاب	50.00	تبلیغی تحریک	20.00	حیات طیبہ	7.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00	تجدید دین	25.00	باغ جنت	7.00
عظمت قرآن	35.00	عقلیاتِ اسلام	35.00	نار جہنم	7.00
عظمت اسلام	50.00	قرآن کا مطلوب انسان	8.00	سچا راستہ	8.00
عظمت صحابہ	7.00	دین کیا ہے؟	7.00	دینی تعلیم	7.00
دین کامل	60.00	اسلام دین فطرت	7.00	خلیج ڈائری	10.00
الاسلام	45.00	تعمیر ملت	7.00	رہنمائے حیات	7.00
ظہور اسلام	50.00	تاریخ کا سبق	7.00	تعدد ازدواج	7.00
اسلامی زندگی	40.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	ہندستانی مسلمان	50.00
احیاء اسلام	35.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	روشن مستقبل	7.00
راز حیات	65.00	تعارف اسلام	5.00	صوم رمضان	7.00
صراطِ مستقیم	40.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	اسلام کا تعارف	5.00
خاتونِ اسلام	60.00	راہیں بند نہیں	12.00	علما اور دور جدید	10.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	ایمانی طاقت	7.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	اتحاد ملت	7.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
الربانیۃ	40.00	سبق آموز واقعات	7.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
کاروانِ ملت	45.00	زلزلہ قیامت	10.00	یکساں سول کوڈ	5.00
حقیقت حج	30.00	حقیقت کی تلاش	10.00	اسلام کیا ہے؟	8.00
اسلامی تعلیمات	35.00	پیغمبر اسلام	5.00	میوات کا سفر	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	آخری سفر	7.00	قیادت نامہ	35.00
حدیث رسول	40.00	اسلامی دعوت	7.00	منزل کی طرف	5.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00	حل یہاں ہے	10.00	اسفار ہند	25.00
راہ عمل	25.00	امہات المومنین	20.00	ڈائری ۹۰_۱۹۸۹	00.00
تعبیر کی غلطی	80.00	تصویر ملت	85.00	قال اللہ و قال الرسول	0.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00				

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-tv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

الرسالہ، اگست ۲۰۰۰

فہرست

فلسفۂ صحبت 4

شیر کا طریقہ 6

ایک کتاب 7

کبر کی علامت 9

دردناک انجام 11

توہین کا مسئلہ 12

اسلوب تنقید 13

گناہ کیا ہے 14

مغربی یوپی کا سفر 16

سوال و جواب 40

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۴۸ 45

دینی مدارس: ایک نئی کتاب 49

ایجنسی الرسالہ 50

فلسفۂ صحبت

"ایک بڑا سائنسداں جو چیز اپنے شاگرد کو دیتا ہے، وہ ایک ذہنی رجحان (attitude of mind) ہے۔" ایک مبصر نے یہ بات نوبل انعام پانے والوں کی ایک جماعت کا جائزہ لینے کے بعد لکھی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی سائنسداں کو نوبل انعام پانے کے قابل بنانے والی چیز یہ نہیں ہے کہ اس کو کہیں سے سائنسی معلومات کا بڑا ڈھیر حاصل ہو گیا تھا۔ وہ چیز جس نے اس کو اس عالمی اعزاز کا مستحق بنایا، وہ صرف اخذ و مطالعہ کا ایک ذہنی رجحان تھا جو کسی بڑے سائنسداں کی صحبت سے اسے ملا تھا۔ اسی چیز نے بالآخر اس کو ترقی کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

صوفیاء کے یہاں جس چیز کو صحبت کہا جاتا ہے اس کی اصل بھی یہی ہے۔ یہ صحبت کوئی پراسرار چیز نہیں۔ یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مذہبی شخصیت کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور غیر مذہبی شخصیت کے یہاں بھی۔

ایک شخص جس نے لمبی جدوجہد کے بعد علم اور تجربہ میں اپنا حصہ پایا ہو اس کی ہر بات گہرے معانی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو وہ علوم کے سرے کو بتاتا ہے۔ وہ جب تبصرہ کرتا ہے تو اس کا تبصرہ ایک بڑے ذخیرۂ کتب کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے تجربات بیان کرتا ہے تو وہ برسوں کے درمیان پھیلے ہوئے سفر کو چند منٹوں میں سمیٹ رہا ہوتا ہے۔ وہ جب مشورہ دیتا ہے تو اس کے مشورہ کے پیچھے نشیب و فراز اور کامیابی و ناکامی کی طویل کہانی چھپی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ گزر چکا ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک کتاب ہوتا ہے، اس کی ہر تقریر ایک پورے کتب خانہ کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اس کا بولنا پوری تاریخ کا بولنا ہوتا ہے اور اس کا سوچنا پورے عالم بشری کا سوچنا۔

یہی فلسفۂ صحبت کا خلاصہ ہے۔ زیر صحبت آدمی اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ صاحب صحبت نے جو چیز ایک عمر صرف کر کے حاصل کی ہے، اس کو وہ چند لمحات صرف کر کے حاصل کر لے۔

زیر صحبت آدمی صاحب صحبت سے صرف علم حاصل نہیں کرتا، اسی کے ساتھ، وہ ایک زاویۂ نظر بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ صرف معلومات نہیں لیتا بلکہ وہ اسی سے تڑپ بھی پاتا ہے۔ اس کو صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ کتابوں اور مصنفوں کے نام سن کر اپنی فہرست مکمل کر لے بلکہ اس کی صحبت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ علم کی ہواؤں میں سانس لے اور معرفت کے سمندروں میں نہائے۔ تاہم یہ فائدہ صرف حقیقی طالب کے لئے ہے نہ کہ محض ظاہری طور پر صحبت میں بیٹھنے والے کے لیے۔

قرآن میں اہل ایمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے "یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین (التوبہ 119) یعنی اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ یہ سچے لوگ یا صادقین کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ (استوت ظواھرھم وبواطنھم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی۔ ۲۸۹/۸

اس قسم کے صادقین کی صحبت میں بیٹھنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ہر بیان مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔ وہ وہی کہتے ہیں جو انہیں کہنا چاہئے، وہ وہی بولتے ہیں جو انہیں بولنا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کے اندر سچائی کا مزاج پرورش پاتا ہے۔ وہ بے بنیاد باتوں میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف ابھرتے ہیں۔ ان کی نیتوں میں پاکی اور ان کے قول میں سنجیدگی آجاتی ہے۔

ایسے لوگ بے حد نادر الوجود ہیں جو صحبت سے یا اپنے ماحول سے اثر نہ لیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ دوسروں سے اثر لیتے ہیں۔ وہ ویسے ہی بن جاتے ہیں جیسا کہ ان کے گرد و پیش کا ماحول ہو۔ اس لئے آدمی کو صحبت کے معاملہ میں بے حد محتاط رہنا چاہئے۔ قرآن کے مطابق قابل صحبت آدمی وہ ہے جس کے ظاہر اور باطن میں فرق نہ پایا جاتا ہو۔

شیر کا طریقہ

امریکہ کی ایک سائنٹفک سوسائٹی ہے جو ۱۸۸۸ میں قائم ہوئی اس کا نام نیشنل جغرافی سوسائٹی (National Geographic Society) ہے۔ اس ادارہ نے خصوصی اہتمام کے تحت شیروں کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے۔ یہ فلم شیروں کی حقیقی زندگی پر مشتمل ہے جو افریقہ کے جنگلوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ میں نے اس کو وی۔ سی۔ آر پر دیکھا ہے۔ اس ڈاکومنٹری فلم میں شیر کی حقیقی زندگی کے بہت سے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس میں ایک منظر یہ تھا کہ شیر ایک جانور کا شکار کرتا ہے۔ بکری کے قسم کے اس جانور کو وہ منھ میں دبا کر لاتا ہے اور اس کو پانی کے ایک تالاب کے کنارے رکھتا ہے۔ اس کے بعد شیر تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ہٹ کر کہیں اور چلا گیا۔ وہ جب دوبارہ وہاں لوٹا تو وہاں یہ منظر تھا کہ تالاب کا ایک گھڑیال تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا۔ اس نے اپنا لمبا منھ نکال کر شکار کو اپنے منھ میں دبا لیا اور اس کے بعد وہ پیچھے کی طرف پانی میں جانے لگا۔ ابھی وہ جانور کو لے کر پوری طرح پانی میں داخل نہیں ہو پایا تھا کہ شیر وہاں آ گیا۔

بظاہر یہ شیر کے لئے ایک سخت اشتعال انگیز لمحہ تھا۔ اس کے شکار کو ایک اور جانور اس کی آنکھوں کے سامنے لئے چلا جا رہا تھا۔ مگر شیر خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے شکار کو چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ شکار اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ شیر کا طریقہ ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہے، اس کے باوجود وہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ متحمل مزاج ہوتا ہے۔ وہ ٹکراؤ کے موقع پر آخری حد تک اعراض اور رواداری برتتا ہے۔ وہ طاقت کا استعمال صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ اس کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔

ایک کتاب

روحانیت کے موضوع پر ایک کتاب ہے جو ۱۹۹۴ میں امریکہ سے چھپی ہے۔ اس میں فطرت (Nature) کو روحانیت کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ۲۸۲ صفحات کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

This Blue Planet: Finding God in the Wonders of Nature. –Janice Miller

اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہمارے لئے بطن مادر (womb) کی طرح گویا ایک اور بطن ہے (صفحہ ۲۷۹) اس دنیوی بطن میں ہم اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہاں کے واقعاتِ قدرت سے روحانی غذا لے کر اپنی شخصیت کی تعمیر کریں۔ یہاں اس نیلے کرۂ ارض پر ایک ابدی وجود کی حیثیت سے ہماری تشکیل کی جارہی ہے:

Here on this Blue Planet, we are being shaped into eternal beings.(p. 9)

اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہمارے اندر وہ شخصیت تیار ہوتی ہے جو آخرت میں بسنے کے قابل ہو۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ جب ہمارا ارتقاء مکمل ہو جائے گا تو ایک معیاری روحانی وجود کی حیثیت سے ایک سچی، روحانی دنیا میں ہم دوبارہ جنم لیں گے، اگر ہم اس دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں:

When we are fully developed, we will be "born" into the true world, the spiritual world, as the perfect spiritual beings we will become if we choose to serve Him (p. 9)

یہ بات اصولی طور پر درست ہے مگر یہاں دو باتوں کا اضافہ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس روحانی سفر کے لئے ایک گائڈ بک درکار ہے اور وہ گائڈ بک صرف قرآن ہے۔ قرآن اپنی اصل حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے اس روحانی سفر کے لئے واحد اور مستند الہامی گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ دنیا کے بعد دوسری جو معیاری دنیا بننے والی ہے اس میں صرف ان افراد کو جگہ ملے گی جو آج کی دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرلیں۔ جو لوگ آج کی غیر معیاری دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرنے میں ناکام رہیں وہ اگلی دنیا میں صرف وہاں کے کوڑے خانہ میں جگہ پائیں گے۔

عالم فطرت میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی صفاتِ کمال کا مظہر ہے۔ یہاں خالق اپنی تخلیقات میں نمایاں ہوا ہے۔ اس طرح فطرت کی دنیا ہمارے لئے خالق کی معرفت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہم خالق کو نہیں دیکھتے مگر ہم اس کی تخلیقات میں اس کے جلووں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس طرح فطرت ہمارے لئے خالق فطرت سے قربت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ایک حقیقی انسان فطرت کے اندر خالق کے پڑوس کا تجربہ کرتا ہے، ہواؤں کے جھونکے اس کو لمس خداوندی کا تجربہ کراتے ہیں۔ روشن آفتاب کی صورت میں وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ خلاء کی وسعتیں اس کو خدا کی بے پناہ عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ دریاؤں کی روانی اس کو خدا کی رحمت سے آشنا کرتی ہے۔ فطرت کے بے پناہ حسن میں وہ خالق کے برتر حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چڑیوں کے نغمے میں اس کو چڑیوں کے خالق کی حیات بخش آواز سنائی دیتی ہے۔ دنیا میں بکھرے ہوئے ہر قسم کے سامانِ حیات اس کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کا خالق ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے بے خبر نہیں۔ اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی کا ہر تجربہ اس کے لئے خالق کے تعارف کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اس طرح کے لطیف تجربات کے درمیان آدمی کی روحانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ وہ عام انسان سے ترقی کر کے ایک ربانی انسان بنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے وجود کے اندر وہ کامل انسان بن کر تیار ہو جاتا ہے جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے قابل ہو ــــــ اسی خدائی پڑوس کا دوسرا نام جنت ہے۔

کبر کی علامت

ایک شخص اگر کسی آدمی پر بے بنیاد الزام لگائے، اس کو غلط طور پر بدنام کرے۔ اس کو لوگوں کے سامنے ذلیل کرے، تو یہ بلاشبہہ ایک بدترین گناہ ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جس کو غلطی کرنے کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہی نہ ہو۔ ایسا آدمی اللہ کی نظر میں مبغوض ترین انسان ہے۔ اس کو کبھی اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شخص وہ ہے جسے بعد کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے خواہ یہ احساس اپنے ضمیر کی بنیاد پر ہوا ہو یا فریق ثانی کی وضاحت اور دلائل کی بنیاد پر۔ اب یہ شخص اگر ایسا کرے کہ اپنے ظاہری رویہ کو بدل لے اور فریق ثانی سے دوبارہ اپنے تعلق کو بحال (patch up) کر لے تو اس کا ایسا کرنا صرف ایک سماجی فعل ہوگا۔ دینی معنوں میں وہ کوئی عبادتی فعل نہ ہوگا۔

جب کوئی شخص مذکورہ قسم کا مجرمانہ فعل کرتا ہے تو یہ دراصل کبر کی نفسیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ اظہارِ کبر کا ایک معاملہ ہوتا ہے نہ کہ سادہ طور پر محض سماجی آداب کی خلاف ورزی کا معاملہ۔ ایسی حالت میں اگر وہ شخص صرف یہ کرے کہ عملی طور پر فریق ثانی سے اپنے تعلق کو بحال کر لے تو اس کے ایسا کرنے سے برائی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اصل برائی جس کا اس نے ارتکاب کیا وہ تو تکبر تھا۔ پھر سماجی آداب کی سطح پر ازالہ کرنے سے اصل جرم کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔

جب ایک شخص مذکورہ قسم کا جرم کرنے کے بعد صرف یہ کرے کہ وہ ظاہری طور پر فریق ثانی سے تعلق کو بحال کر لے مگر اپنی زبان سے غلطی کا کھلا اعتراف نہ کرے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا اصل جرم (تکبر) بدستور اس کے سینہ کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا دل تکبر سے خالی ہوتا تو اس کو اس وقت تک تسکین نہ ملتی جب تک وہ اپنی زبان سے اس کا اقرار نہ کر لیتا۔

قولی اعتراف آدمی کے متواضع ہونے کا ثبوت ہے اور قولی اعتراف نہ کر کے ظاہری تعلق کو بحال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات میں جی رہا ہے۔ وہ اپنے کبر کے

بت کو توڑنے کے لئے تیار نہیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال قرآن کی سورۃ نمبر ۱۲ میں ملتی ہے۔ امرأۃ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک بے بنیاد الزام لگایا۔ بعد کو حقیقت ظاہر ہوئی تو اس نے کھلے طور پر کہا کہ "اب حق واضح ہو گیا۔ اس معاملہ میں غلطی میری ہی تھی اور یوسف بلاشبہہ سچے ہیں" (یوسف ۵۱)

حق کی وضاحت کے بعد اگر امرأۃ عزیز صرف یہ کرتی کہ ظاہری طور پر اپنی روش کو درست کر لیتی اور زبان سے اس کا اعلان نہ کرتی تو اس کا جرم کبھی ختم نہ ہوتا۔ مگر جب اس نے اپنی زبان سے کہا کہ ساری غلطی میری ہے اور یوسف بلاشبہہ بری الذمہ ہیں تو اس کا جرم معاف ہو گیا اور اس کا درجہ بلند ہو گیا۔

اسلامی شریعت کے مطابق، کبر ایک ایسی روش ہے جو اللہ کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر۔ (مشکاۃ المصابیح ۳/ ۱۴۱۳) یعنی وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل کے اندر ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ کبر کی پہچان کیا ہے۔ حدیث کے مطابق، کبر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے ایک حق بات پیش کی جائے مگر وہ اس کو صرف اس اندیشہ کی بنا پر نظر انداز کر دے کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں اس کی حیثیت عوام کی نظر میں گھٹ جائے گی۔ وہ کسی ایسے حق کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو جو بظاہر اس سے کمتر کسی آدمی کی طرف سے پیش کیا گیا ہو۔

اس دنیا میں ہر قسم کی بڑائی صرف ایک اللہ کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی کو کسی بھی قسم کی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔ اگر بظاہر کوئی بڑا دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف اس کے امتحان کا ایک پرچہ ہے نہ کہ اس کی واقعی حیثیت کا اظہار۔ ایسی حالت میں جو شخص بڑائی پا کر جھک جائے وہ امتحان میں پورا اترا۔ اور جو شخص بڑائی پا کر متکبر بن جائے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اللہ کے یہاں اس کے لئے ذلت کی سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

دردناک انجام

دمشق کی تاریخ کے ساتھ جن لوگوں کے نام شامل ہیں ان میں سے ایک ٹی ای لارنس (T.E.Lawrence) ہے۔ یہ ایک انگریز تھا جو ۱۸۸۸ میں پیدا ہوا۔ اس نے عرب علاقہ کی تاریخ پڑھی اور عربی زبان سیکھی۔ اس کے بعد عربی لباس پہن کر عربوں کے درمیان داخل ہو گیا۔ ۱۸۔۱۹۱۴ کے درمیان اس نے دمشق کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس وقت عرب ممالک بشمول شام پر ترکوں کی حکومت تھی۔ لارنس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ عربوں میں ترکوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ عربوں کے اندر عرب قومیت کا جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ لارنس کی یہ کہانی حسب ذیل کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے:

Lawrence of Arabia, by Richard Aldington

کرنل لارنس بظاہر اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ مگر اس کا آخری انجام نہایت دردناک تھا۔ انگریزی حکومت نے اس کو اس کے حوصلہ کے بقدر "انعام" نہیں دیا۔ وہ مایوسی کے عالم میں ۲۶ فروری، ۱۹۳۵ کو رائل ائر فورس سے ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے آخری ایام گزارنے کے لئے کلاوڈس ہل (Clouds Hill) چلا گیا۔ وہ ایک شکستہ دل انسان کی طرح یہاں اپنے صبح و شام گزار رہا تھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۳۵ کو موٹر سائیکل کے حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا۔ اور چھ دن تک بے ہوش رہ کر مر گیا۔

A motorcycling accident on May 13, (1935) solved the problem of his future. He died six days later without regaining consciousness (10/727)

توہین کا مسئلہ

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ توہین اسلام کا مسئلہ جانتے ہیں، مگر وہ توہین مسلم کا مسئلہ نہیں جانتے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کی توہین کردے تو تمام لوگ بھڑک اٹھیں گے اور اس کے خلاف پرجوش مہم شروع کردیں گے۔ لیکن ایک مسلمان ہر روز دوسرے مسلمان کی توہین کرتا ہے اور اس پر کوئی نہیں بھڑکتا، اس کو اس طرح نظر انداز کردیا جاتا ہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالاں کہ شریعت کے مطابق، مومن کا اکرام فرض ہے اور مومن کی توہین حرام۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کی توہین کرے تو ایسا واقعہ نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے قومی غیرت اور قومی فخر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے فخر کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلم کی توہین عملاً احتساب خویش کا مسئلہ ہے، اور احتساب خویش بلاشبہہ ان لوگوں کے اوپر بہت سخت ہے جو اپنے دل میں اللہ کا خوف نہیں رکھتے۔ اسلام اللہ کا آخری دین ہے۔ اللہ نے اس کے لئے ابدی عظمت کا فیصلہ کردیا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اسلام کو زیر کرسکے۔ اسلام کا ابدی محافظ خود اللہ ہے، اور اللہ سے بڑا محافظ اور کون ہو سکتا ہے۔

مگر جہاں تک توہین مسلم کا معاملہ ہے اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ہے۔ مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ کسی مسلمان کی توہین نہ کریں۔ اور جب کوئی شخص ایک مسلمان کی توہین کرے تو اس کو ایسا کرنے سے روک دیں۔ جو مسلم معاشرہ اس روح احتساب سے خالی ہو جائے وہ اللہ کی رحمتوں سے بھی دور ہو جائے گا۔

اغیار کی طرف سے قومی فخر پر زد پڑے تو اس پر بھڑک اٹھنا اور جب خود اپنی اصلاح یا احتساب کا مسئلہ ہو تو اس پر بے حس بنے رہنا ایمان کی موت کی علامت ہے نہ کہ ایمان کی زندگی کی علامت۔

اسلوب تنقید

مولانا انیس لقمان ندوی نے بتایا کہ ۲۲ جون، ۱۹۹۸ کو ابو ظبی میں ڈاکٹر عزالدین ابراہیم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دوران ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ابتداء ہی میں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھ سے صرف فصیح عربی میں بات کریں۔ کیوں کہ میں فصیح عربی کے معاملہ میں اس سے زیادہ غیور ہوں جتنا غیور کوئی مرد اپنی بیوی کے معاملہ میں ہوتا ہے اور یہ کہ اگر آپ مجھے فصحی میں گالی دیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ آپ عامی زبان میں میری تعریف کریں (كلّمني من فضلك بالعربية الفصحى، فاني والله أغار على اللغة العربية الفصحى أكثر مما يغار الرجل على زوجته. ولو شتمتني بالفصحى، فانه أحب إلي من أن تمدحني بالعامية) یہ سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ بات آپ نے اتنے خوب صورت پیرایہ میں کہی ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ ضرب المثل بن جائے (إن كلامك هذا مصوغ صياغة رائعة لدرجة أنه ليكاد أن يكون مضرب المثل)

مولانا انیس لقمان ندوی نے مذکورہ عرب سے جو بات کہی وہ عربوں کے لیے ایک سخت تنقید کی حیثیت رکھتی تھی کیوں کہ عرب دنیا میں علماء تک کا یہ حال ہے کہ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو غیر فصیح زبان بولنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ مصر میں یہ حال ہے کہ فصیح زبان میں گفتگو کرنا ادبی اعتبار سے غیر معیاری ہے۔ ایسے آدمی کو دیہاتی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ غیر فصیح زبان بولنے کا رواج شہروں میں ہے نہ کہ دیہات میں۔

مگر اس کھلی تنقید کو انہوں نے برا نہیں مانا۔ اس کی وجہ تنقید نہیں ہے بلکہ تنقید کا اسلوب ہے۔ ناقد نے اگرچہ ایک تنقیدی بات کہی تھی لیکن اس کے لئے انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا جو نہ صرف غیر جارحانہ تھا بلکہ اس میں عربی زبان کا ایک اعتراف بھی تھا۔ اس میں ایک عرب کے لئے اس کی پر فخر نفسیات کی تسکین موجود تھی۔

گناہ کیا ہے

گناہ (sin) کیا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نظریہ وہ ہے جو فطرت (nature) پر مبنی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں گناہ کے اسباب موجود ہیں۔ اس لئے انسان مجبور ہے کہ وہ گناہ کرے، یہ رائے ان لوگوں کی ہے جن کو جبریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جو تربیت (nurture) پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ پیدائشی طور پر انسان سادہ ورق کی مانند ہوتا ہے۔ گرد و پیش کی دنیا یا سماجی حالات مرد یا عورت کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا گناہ کے فعل کا ذمہ دار خارجی سماج ہے نہ کہ خود انسان۔

گناہ کا تیسرا تصور وہ ہے جو خصوصی طور پر مسیحی چرچ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطابق پہلے انسان آدم نے جنت میں ایک گناہ کیا جس کو مسیحیت میں معصیت اصلی (original sin) کہا جاتا ہے۔ انسانِ اول کے اس گناہ کے سبب ساری نسل انسانی گناہ گار ہو گئی۔ اب اس کے لئے پاک ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ مصلوب ہو کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

گناہ کے بارے میں اسلام کا تصور ان سب سے مختلف ہے۔ اسلام کے مطابق انسان موجودہ دنیا میں امتحان (ٹسٹ) کے لئے پیدا کیا گیا ہے (الملک ۲) امتحان کی اسی مصلحت کی بنا پر انسان کو قول و عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ انسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور جس طرح چاہے زندگی نہ گزارے۔ اس اختیار کو قرآن میں الامانۃ کہا گیا ہے (الاحزاب ۷۲)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو آزادی دینے کے ساتھ یہ بتادیا ہے کہ فکر اور قول اور عمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست ہے اور قول و عمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست نہیں (الشمس ۸)

قرآن کے مطابق، انسان کو اس دنیا میں یہ اختیار تو حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کو جس طرح چاہے استعمال کرے مگر اس کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ آزادی کے استعمال کے نتائج کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔ مثلاً انسان یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ آگ کے انگارہ کو اپنے ہاتھ میں لے یا نہ لے۔ لیکن آگ کے انگارے کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس فعل کے انجام سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تصورِ گناہ کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو غلط استعمال کرے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ خدا کی ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائے۔

گناہ کی پہچان کیا ہے۔ اس کی ایک خارجی پہچان ہے اور ایک داخلی پہچان۔ خارجی پہچان سے مراد خدا کی کتاب ہے۔ خدا کی کتاب (قرآن) میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو خدا کے نزدیک گناہ ہیں اور جن سے آدمی کو بچنا چاہئے۔ گناہ کی داخلی پہچان انسان کا ضمیر (conscience) ہے۔ قرآن کے مطابق، انسان کے اندر پیدائشی طور پر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ (الشمس ۸) اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: الاثم ما حاك في صدرك و كرهت أن يطلع عليه الناس (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم کو یہ ناگوار ہو کہ لوگ اس کو جان لیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان صحیح فطرت پر پیدا کیا گیا ہے (الروم ۳۰) یہی بات حدیث میں بھی بتائی گئی ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک گناہ کرنا انسان کا مقدر نہیں بلکہ وہ اس کے لئے choice کا ایک معاملہ ہے۔ انسان کو شیطانی طاقتیں بہکاتی ہیں۔ اسی طرح سماجی اسباب اس کو غلط راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اسباب سے متاثر ہو کر گناہ کرے تو وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اسلام کی دوسری تعلیم یہ ہے کہ گناہ کی تلافی ممکن ہے۔ اگر آدمی گناہ کے بعد توبہ کرے اور آئندہ وہ اس سے باز رہے تو وہ اللہ کے نزدیک قابل معافی ٹھہرے گا۔

مغربی یوپی کا سفر

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کی دعوت پر سہارنپور کا سفر ہوا۔ ۹ر اپریل، ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی اور ۱۰ اپریل کی شام کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں سہارنپور اور مغربی یوپی کے دوسرے علاقوں کے حالات جاننے کا موقع ملا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ جس تاریخ کو سہارنپور کا یہ پروگرام تھا ٹھیک اسی تاریخ کو بنگلور میں مختلف مذاہب کی ایک انٹر نیشنل کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں بودھ پیشوا دلائی لاما بھی آرہے تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ ان لوگوں نے میرے مددگار سمیت سفر کے متعلق انتظامات بھی مکمل کر دئے تھے۔ مگر میں دونوں میں سے کسی ایک ہی پروگرام میں شریک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بنگلور کو چھوڑ کر سہارنپور کا فیصلہ کیا۔ ۹ر اپریل کی صبح کو دہلی سے شتابدی اکسپریس کے ذریعہ روانگی تھی۔ یہ ٹرین ہندستان کی ایک خصوصی ٹرین سمجھی جاتی ہے۔ مگر مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں وہ ہر اعتبار سے ایک معمولی ٹرین ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش حکومت کے زمانہ میں ہندستان کی ٹرینیں تقریباً اسی درجہ کی تھیں جیسا کہ یورپ کے ملکوں کی ٹرینیں۔ مگر آزادی کے بعد مغربی ملکوں کی ٹرینیں نمایاں طور پر بہتر ہو گئیں جب کہ ہندستان کی ٹرینیں ترقی کے اس انٹر نیشنل معیار تک نہ پہنچ سکیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں ترقی کا جو عمل ۱۹۴۷ تک جاری تھا وہ ۱۹۴۷ کے بعد اسی رفتار سے جاری نہ رہ سکا۔ حالانکہ ۱۹۴۷ کے بعد سے لے کر اب تک ہمارے ملک میں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں کی دھوم رہی ہے۔ دونوں زمانوں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ ایک لفظ میں وہ کرپشن ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ حکومت جو بجٹ بناتی تھی وہ پوری طرح انہیں مدوں میں خرچ ہوتا تھا جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد برعکس طور پر یہ ہوا کہ

حکومت کا بجٹ تو بدستور مزید اضافہ کے ساتھ بنتا رہا مگر کرپشن کی بنا پر اس کی بیشتر رقم قومی ترقی کے کاموں میں خرچ نہ ہو کر افراد کے جیبوں میں جاتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہمارے ملک میں جو نئے نئے مسائل پیدا ہوئے ان سب کا سبب، براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہاں کا بڑھا ہوا کرپشن ہے۔

۹ اپریل ۲۰۰۰ کو صبح سویرے میں نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ سورج نکلنے میں چند منٹ کی دیر تھی۔ اسٹیشن پر لوگ بڑی تعداد میں سرگرم دکھائی دئے۔ ہر آدمی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کیا چیز ہے جو ان لوگوں کو اس طرح مسلسل سرگرم کئے ہوئے ہے۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ وہ صرف سیلف انٹریسٹ ہے۔ فطرت نے ہر آدمی کے اندر سب سے طاقتور جذبہ انٹریسٹ کا رکھا ہے۔ وہی ہر آدمی کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ اگر انٹریسٹ نہ ہو تو پوری زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔ سوچتے ہوئے پھر میرا ذہن اس سوال پر گیا کہ کیا وجہ ہے کہ سوشلسٹ سسٹم دنیا میں ناکام ہو گیا۔ روس سے لے کر انڈیا تک ہر جگہ اس کی کہانی یہی ہے۔ اس کے برعکس بدنام سرمایہ داری سسٹم اتنا زیادہ کامیاب ہے کہ آج بڑے بڑے سوشلسٹ لیڈروں کے بیٹے اور پوتے بھاگ بھاگ کر امریکہ پہنچ رہے ہیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بدنام سرمایہ داری نظام فطرت کے اصول پر قائم ہے جو کہ سیلف انٹریسٹ پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس نام نہاد سوشلسٹ نظام مصنوعی آئیڈیالوجی پر قائم کرنے کی ایک کوشش تھی جو کہ فیل ہو گئی۔

شتابدی اکسپریس اپنے ٹھیک وقت پر سات بجے دہلی سے روانہ ہوئی۔ میرے قریب والی سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ ان کا نام روہت درما ہے۔ ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ وہ احمد آباد میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ (Tel-423344)

وہ دہرہ دون نیشنل ڈیفنس اکیڈمی میں ٹیسٹ دینے کے لئے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مسلمانوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اب تک ان کی

ملاقات نہ کسی مسلمان سے ہوئی، اور نہ اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے کچھ پڑھا۔ میں ان کی زندگی میں پہلا مسلمان تھا جس کے ساتھ انہوں نے ۳ گھنٹہ سفر کیا اور بات چیت کی۔ انہوں نے بتایا کہ میرے اسکول میں نہ کوئی مسلمان اسٹوڈینٹ ہے اور نہ کوئی مسلمان ٹیچر۔ میں نے سوچا کہ دو فرقوں کے درمیان اس دوری کا سبب کیا ہے۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان مسلم رہنماؤں پر ہے جنہوں نے ناقابلِ فہم طور پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ موجودہ زمانہ میں اسکول اور کالج دونوں فرقوں کے لئے فطری میٹنگ گراونڈ بن رہے تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں کی غلط تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوان اس میدان میں پہنچ ہی نہ سکے جہاں جدید تاریخ نے ان کے لئے ملاقات (انٹر ایکشن) کا انتظام کیا تھا۔

ٹرین میں اخبارات پڑھنے کے لئے دئے گئے۔ سنڈے آبزرور (۹ اپریل) میں آندھرا پردیش کے چیف منسٹر چندرابابو نائڈو کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ وہ آج کل اس حیثیت سے مشہور ہو رہے ہیں کہ آندھرا پردیش کو انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں پہنچائیں۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ یہ جدید ٹکنیک سرخ فیتہ شاہی کو ختم کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی جو انڈیا کی بیوروکریسی میں بہت زیادہ سرایت کر چکی ہے۔

It may prove to be a good tool to remove the red-tapism so inbuilt in Indian bureaucracy.

تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری ٹرین سہارنپور ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں کئی لوگ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ڈاکٹر جی۔ بی لال (G.B. Lal)، جناب سیودھ کانت شرما، جناب محمد سلیم رومانی، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر شبیر احمد بیگ، ذوالنور احمد، لئیق احمد، راجیو، منوج، دانش خان، حکیم نفیس الرحمٰن، وغیرہ۔

ٹرین میں میں نے مسٹر روہت ورما سے کہا تھا کہ میرا ڈریم یہ ہے کہ اس ملک کے ہندو مسلمان ایک فیملی کی طرح مل جل کر رہنے لگیں۔ پلیٹ فارم پر جب میں نے دیکھا کہ ہندو مسلم دونوں میرے انتظار میں ہیں اور جیسے ہی میں اپنی کوچ سے نکل کر باہر آیا تو وہ پھولوں کے ہار کے

ساتھ میری طرف بڑھے تو میری آنکھوں میں شدت احساس سے آنسو آگئے۔ اس بات کے لئے نہیں کہ وہ میرا سواگت کر رہے تھے، بلکہ اس مشترک گروپ کی صورت میں مجھے مستقبل کا انڈیا دکھائی دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ملک میں بہت جلد وہ دور آنے والا ہے جبکہ ہندو اور مسلمان سچ مچ ایک فیملی کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے اور دونوں مل کر اس عظیم ہندستان کی تعمیر کریں گے جس کا خواب ہمارے قومی معماروں نے دیکھا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہو کر ہم لوگ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ یہاں سہارنپور کے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مجلس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، میں نے اپنی عادت کے مطابق لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنے اپنے تجربات بتائیں۔ چنانچہ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے، ان سب کے خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ آج کی زندگی میں مذہب کا وہ رول ختم ہو گیا ہے جو پچھلے زمانوں میں تھا۔ پچھلے زمانہ میں ہر آدمی خدا سے ڈرتا تھا۔ خدا کا خوف اس کو غلط کاموں سے روک دیتا تھا۔ اب آزادی اور ڈیموکریسی کے دور نے ہر آدمی کا مزاج یہ بنا دیا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس مزاج نے لوگوں کو بے خوف بنا دیا ہے اور یہی بے خوفی تمام بدعنوانیوں کی جڑ ہے۔

ڈاکٹر شاہد صابری (امبیٹھ) نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں انہوں نے "ناخواندگی ہٹاؤ" کے مقصد کے تحت لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرنا چاہا مگر تجربہ کے بعد محسوس ہوا کہ حقیقی معنوں میں ساتھ دینے والا کوئی نہیں، البتہ رکاوٹ کے لئے ہر آدمی تیار ہے۔ اسی کشمکش میں کئی سال بیت گئے۔ آخر کار آٹھ سالہ تجربہ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ساتھ دے یا نہ دے ان کو اب اکیلے ہی یہ کام کرنا ہے۔

انہوں نے کہا کہ "اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اور اپنے وسائل کو بھرپور طور پر اس تعلیمی مشن میں لگا دیا۔ ۱۹۸۳ میں میں نے پہلی کلاس کھول کر نامساعد حالات میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب ۲۰۰۰ میں خدا کے فضل سے ہمارا ادارہ انٹر میڈیٹ تک پہنچ چکا ہے۔ تقریباً پانچ سو طلبہ ہمارے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

جناب سبودھ شرما ایڈوکیٹ نے ایک بنیادی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بظاہر بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک یہاں صرف اس انتظار میں ہے کہ کب اس کی ٹرین آئے اور وہ اس پر بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہو جائے۔ ہماری زندگی بھی اسی قسم کا ایک سفر ہے۔

مسٹر راجیو کوشک (ایم۔بی۔اے) نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے بزرگوں نے جس طرح کے سماج میں زندگی بتائی، آج کا سماج اس سے بہت زیادہ الگ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم اپنے پریوار میں ہوتے ہیں تو وہاں ہم پاتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کا ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ ہر ایک دوسرے کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی ترقی پر خوش ہوتا ہے۔ پہلے ایسا تھا کہ جو ماحول آدمی کو اپنے پریوار میں ملتا تھا وہی ماحول اس کو باہر آکر سماج میں بھی ملتا تھا۔ مگر آج ایسا نہیں ہے۔ آج یہ حال ہے کہ ہم جب اپنے پریوار میں ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنوں کے بیچ میں ہیں مگر جب ہم پریوار سے نکل کر سماج میں آتے ہیں اور کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو اچانک یہاں دوسرا ماحول ملتا ہے۔ ہم پاتے ہیں کہ یہاں مدد کرنے کے بجائے رکاوٹ ڈالنے کا ماحول ہے۔ ترقی پر خوش ہونے کے بجائے اس پر جلن کا ماحول ہے۔ ہر ایک دوسرے کو غیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی آج کی سب سے بڑی سمسیا ہے۔ اس کو کیسے حل کیا جائے۔

بی۔پی دیش بھگت (۸۳ سال) ۱۹۷۱ سے پولیٹکس کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ پارٹی کا نام بھارتیہ سماج وادی مورچہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندستان میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پولیٹکل کرپشن ہے۔ اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہماری پارٹی پاور میں آجائے گی تو ہم دیش کو بھرشٹاچار سے مکت کر دیں گے۔

میں نے کہا کہ بہت سی پارٹیاں بھرشٹاچار مٹاؤ کے اشو کو لے کر اٹھیں۔ مگر جب وہ الیکشن جیت کر پاور میں آگئیں تو انہوں نے خود بھی بھرشٹاچار کا وہی کام شروع کر دیا جو دوسرے لوگ کر

رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ایکسپلائٹیشن کے ذہن کے تحت کرپشن کو اپنا الیکشنی اشو بنائیں۔ ایسے لوگ وہی کریں گے جن کی آپ نے مثال دی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ایمان دار سماج بنانا آپ کا اصل مقصد ہو اور اس مقصد کو لے کر آپ اپنی پوری تحریک چلائیں، صرف الیکشن کے وقت نہیں، بلکہ اپنی پوری زندگی کے لئے آپ کا یہی مشن ہو۔ اس دوسری قسم کے لوگ جب فطری عمل کے تحت پاور میں آتے ہیں تو وہ ان سے مختلف ہوتے ہیں جو الیکشنی پولیٹکس کے ذریعہ پاور میں آجائیں۔

۹ر اپریل کو مسلسل لوگ میری قیام گاہ پر آتے رہے اور ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں اتنا زیادہ تعصب ہے کہ مسلمانوں کو ہر شعبہ میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ مسلمانوں کی ترقی کا کیا نسخہ بتاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ مسلمان تو بروقت ہی ترقی کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مقصد کے لئے کسی نئے نسخہ کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ اس دنیا کا نظام کسی کے تعصب یا سازش پر نہیں چل رہا ہے، بلکہ فطرت کے قانون پر چل رہا ہے اور فطرت کا قانون کسی تعصب کے بغیر ہر ایک کو ترقی کا موقع دے رہا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں یہ معاملہ اور بھی زیادہ ہماری موافقت میں ہو گیا ہے۔ آج ہم ایک نئے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ دراصل اقتصادی انفجار کا دور ہے۔ اس زمانہ میں اقتصادی ترقی کے مواقع عمومی سیلاب کی طرح ہر انسان تک پہنچ رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں ننگے جسم اور ننگے پاؤں والے لوگ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے۔ اس حدیث پر غور کیجئے۔ یہ حدیث دراصل جدید صنعتی دور کی پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ دولت کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں تک پہنچ جائے گا۔ نوبت یہاں تک آئے گی کہ وہ لوگ جو غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی بڑی بڑی کمائی کریں گے، اور بڑے بڑے گھر بنائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ گھر

آدمی کی معاشی حالت کی پہچان ہوتا ہے۔ بڑے گھر کا مطلب ہے معاشی خوش حالی۔

میں نے کہا کہ اس حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ الا المسلمون، یعنی تمام لوگ دولت مند ہو جائیں گے سوائے مسلمانوں کے۔ پھر آپ لوگ اس قسم کی بات کیوں کرتے ہیں۔

۹/اپریل کی شام کو سہارنپور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع وودھ کیندر (چندر نگر) میں تھا اس میں زیادہ تر ہندو صاحبان تھے۔ یہ زیادہ تر وکیل اور ڈاکٹر لوگ تھے۔ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو ہندو قوم پرست تنظیموں کے لیڈر تھے۔

یہ اجتماع دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک رہا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ زیادہ تر ہندو صاحبان اسلام کے بارے میں سوالات کرتے رہے، اور میں ان کا جواب دیتا رہا۔ اکثر سوالات اختلافی نوعیت کے تھے، مگر پوری گفتگو کے دوران کسی قسم کی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے تمام سوالات کا جواب قرآن اور حدیث کی روشنی میں دیا۔ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ لوگوں نے بتایا کہ کئی ہندوؤں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک صاحب جو ایک کٹر ہندو تنظیم کے سکریٹری ہیں انہوں نے آخر میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب جس طرح اسلام کو پیش کرتے ہیں اگر اسی طرح دوسرے لوگ بھی اسلام کو پیش کریں تو اسلام ساری دنیا کا مذہب بن جائے۔

ایک اور ہندو وکیل نے کہا کہ تقریر کے بارے میں لوگوں کا تاثر اتنا شدید تھا کہ لوگ اپنے احساس کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ نہیں پا رہے تھے۔ بس یہ کہتے تھے کہ ــــــ ونڈر فل، مارولس۔ بس اس طرح کے الفاظ بول رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر فطرت کی زبان میں کلام کیا جائے تو اسلام ہر ایک کو خود اپنی چیز نظر آئے گا۔ مگر جب ایسی زبان استعمال کی جائے جو سننے والے کو ایک فرقہ کی وکالت نظر آئے تو فوراً دوسرے فریق کے اندر ضد اور دفاع کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اسلام کو اپنی چیز کے بجائے "غیر" کی چیز سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر سنانے اور سننے والے کے درمیان وہ صحیح ربط ہی نہیں قائم ہوتا جو مثبت دعوتی عمل کے لئے ضروری ہے۔

۹/ اپریل کی شام کو ویودت کلا کیندر کے اجتماع میں ایک پولیس افسر بھی شریک تھے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ ڈاکٹر شاہد نے بتایا کہ انہوں نے اجتماع کے بعد اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

جب آدمی آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ کچھ دوری تک دیکھ لیتا ہے جب چشمہ لگا کر دیکھتا ہے تو کچھ زیادہ دوری تک دیکھ لیتا ہے۔ جب دوربین سے دیکھتا ہے تو کافی دوری تک دیکھ سکتا ہے۔ اور جب اوپر منزل پر کھڑے ہو کر دیکھتا ہے تو کافی کچھ دیکھتا ہے اور جب ہیلی کاپٹر سے دیکھتا ہے تو وہ پورے شہر کو دیکھ لیتا ہے۔ مولانا اتنی اونچائی پر پہنچ چکے ہیں جس سے وہ پورے مانو سماج کو اسی انداز میں دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی ہیلی کاپٹر سوار دیکھتا ہے۔ یہ الفاظ انہوں نے ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دئے۔

"آپ کا بھاشن ان لوگوں کے لئے بہت خطرناک ہے جو اپنی سوچ روپی کانچ کے مرتبان کی یتن پوروک رکچھا کرتے آرہے ہیں۔ آپ کے سہج شبد اس ادھوری وکرت سوچ کو توڑ دیتے ہیں۔"

आपका भाषण उन लोगों के लिए बहुत खतरनाक है जो अपनी सोच रुपी काँच के मर्तबान की यत्न पूर्वक रक्षा. करते आ रहे हैं। आपके सहज शब्द उस अधूरी व विकृत सोच को तोड़ देते हैं।

–Subodh Sharma Advocate, Saharanpur
0132-644020,644752,(M)9837093422

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مشرکوں اور کافروں کے جلسوں میں جاتے ہیں ـــــ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے: اتقوا مواضع التهم (یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو)

میں نے کہا کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ عرب کے مشرکوں اور کافروں کے مقامات اجتماع میں نہ جاتے۔ جب کہ یہ ثابت ہے کہ آپ ایسے مواقع پر برابر جاتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس کا تعلق نیت سے ہے اگر آپ غیر مسلموں کے اجتماع میں دعوت دین کے مقصد سے جائیں تو یہ عین سنت نبوی کی پیروی ہوگی۔ البتہ اگر آپ ایسے مواقع پر کسی غلط

مقصد کے تحت جائیں تو یہ البتہ ممنوع اور قابل اعتراض ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم خان صاحب اپنی میڈیکل پریکٹس کے علاوہ اسلام پر بھی کافی مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ایک ملاقات میں انہوں نے خود اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

موجودہ زمانہ میں علم کا ارتقاء P.H.D. لیول کو پہنچ گیا ہے۔اب ہمیں اسی لیول پر اسلام کی نمائندگی کرنا ہے۔ آج کا انسان جس علمی سطح پر کسی چیز کو سمجھنا چاہتا ہے اسی علمی سطح پر اگر وہ اسلام کو پائے گا تو اسے قبول کرے گا، ورنہ وہ اسے رد کر دے گا۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میں اس دور میں پیدا ہوا ہوں جس دور میں مولانا وحید الدین خاں کا فکر عالمی سطح پر پرواز کر رہا ہے۔ تمام دیگر مسلم اہل قلم اس صحیح فکر کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔

عصمت آرا (۴۰ سال) ڈاکٹر محمد اسلم صاحب کی اہلیہ ہیں۔انہوں نے کہا کہ الرسالہ کی مسلسل تعلیم یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ ٹکراؤ سے درگزر کرتے ہوئے اپنے خاص مقصد یعنی دعوت کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔

مس ارم قدسیہ (۱۴ سال) ڈاکٹر محمد اسلم کی صاحبزادی ہیں۔ان کو تعلیم کا بہت شوق ہے خاص طور پر انگریزی زبان سیکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔ان کا جذبہ یہ ہے کہ وہ انگریزی سیکھ کر دین کی خدمت کریں۔انہوں نے اپنے تیار کئے ہوئے کئی چارٹ دکھائے۔ان میں سے ایک چارٹ کا مضمون یہ تھا:

It is too dangerous to leave politics to politicians alone, similarly, too hazardous to leave theology to theologians alone.

—Mustafa, Chief Mufti of Bosnia

ایک صاحب نے موجودہ زمانہ کی بعض مسلم شخصیتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کو امت میں زبردست کامیابی ملی۔ میں نے کہا کہ کامیابی نہ کہئے بلکہ ذاتی مقبولیت کہئے۔ مقصد میں کامیابی اور شخصی مقبولیت میں فرق ہے۔ غور کیجئے تو ان میں سے کوئی بھی اس معنی میں کامیاب نہیں ہوا کہ

اس کی کوششوں سے امت میں حقیقی زندگی پیدا ہو جائے۔ البتہ ان کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے ایک زوال یافتہ قوم کو اس کی زوال کی سطح پر اس کی پسندیدہ خوراک فراہم کر دی۔ کسی نے لوگوں کی فخر پسندی کو غذا دی۔ کسی نے لوگوں کی جذباتیت کے مطابق انہیں خوراک مہیا کی۔ کسی نے ایسا نسخہ فراہم کیا کہ لوگوں کو بے عملی میں عمل والے فائدے ملتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی نے جنت کے سستے ٹکٹ تقسیم کرنے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ کسی نے ایسا نظریہ دیا جس میں سیاسی ہنگامہ آرائی اعلیٰ اسلامی عمل دکھائی دیتا تھا۔ کسی نے ایسے خوشنما تخیلات دئے جن میں لفظی بلند پروازی سے حقائق کی منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ اس قسم کی باتوں کے ذریعہ مقبولیت حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے خارش زدہ آدمی کو کھجلانے کا نسخہ بتا دیا جائے۔

ایک مجلس میں چھوٹے مکان اور بڑے مکان کا تذکرہ ہوا۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ کل بناء وبال علی صاحبه إلا ما لا، إلا مالا (ہر عمارت اس کے مالک کے لئے وبال ہے۔ سوا اس عمارت کے جو بالکل ضروری ہو۔)

میں نے کہا کہ بڑا مکان اگر ضرورت کے لئے ہو تو وہ یقیناً جائز ہے مگر عام طور پر ایسا ہے کہ لوگ بڑا مکان اس لئے بناتے ہیں کہ سماج میں اونچا درجہ حاصل کر سکیں۔ یہی وہ مکان ہے جس کے بارہ میں اس حدیث میں انتباہ دیا گیا ہے۔ اس قسم کا مکان لوگوں کے اندر احساس فخر پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر یہ نہایت پست چیز ہے۔ کسی انسان کا درجہ در و دیوار سے متعین نہیں ہوتا، بلکہ اخلاقی صفات اور روحانی اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگوں کے لئے شاندار مکان صرف ان کے لئے اور ان کے بچوں کے لئے شاندار قبر بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے مکان میں صرف ایسے لوگ رہتے ہیں جو دینی اور اخلاقی اعتبار سے مر چکے ہوں۔ کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عام طور پر لوگ غربت کو بد نصیبی اور

دولت مندی کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا غلط ہے۔ قرآن کے مطابق، یہ دنیا امتحان کے لئے ہے۔ یہاں ہر چیز امتحان کے لئے ہے۔ غربت بھی امتحان کا ایک پرچہ ہے اور دولت مندی بھی امتحان کا ایک پرچہ۔ کسی کو خدا بے زور حالت میں آزماتا ہے اور کسی کو زور اور طاقت دے کر آزمارہا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ ان چیزوں کو وہ نہ یافت سمجھے اور نہ محرومی۔ وہ اپنی ہر حالت کو امتحان کی حالت سمجھے۔ اس کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس امتحان میں پورا اترے جس میں مبتلا کر کے اس کا خدا اسے آزمارہا ہے۔

سفروں میں آدمی کی جگہ بدلتی ہے۔ ملاقاتوں کا دائرہ بڑھتا ہے۔ نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح مختلف قسم کے لوگوں کے خیالات سامنے آتے ہیں۔ سفر اگر کھلی آنکھ اور کھلے ذہن کے ساتھ کیا جائے تو وہ مسافر کے لئے توسیع مطالعہ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

موجودہ سفر میں کثیر تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی اور بہت سے سوالات سامنے آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کی تحریریں برابر پڑھتا رہا ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد کون۔ میں نے کہا کہ اکثر لوگ اس طرح کا سوال کرتے ہیں۔ مگر میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میری موجودگی میں کون۔ میری دعوتی جدوجہد تقریباً پچاس سال کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس راہ میں میں نے اپنا خون بھشک کر دیا۔ میری شخصیت ویران ہو گئی۔ میرے دن اور رات کا سکون چھن گیا۔ مگر اب بھی وہی حال ہے جس کی مشابہت انجیل میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ہم نے بانسری بجائی مگر تم نے رقص نہیں کیا۔ ہم نے نوحہ کیا مگر تم روئے نہیں۔ (انا زمرنا لکم فما رقصتم و ندبنا لکم فما بکیتم)

۱۹۹۱ میں رام نومی کے موقع پر سہارنپور میں فساد ہوا اس کی خبریں اخبار میں چھپیں۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اس میں سے ایک واقعہ یہ ہوا کہ سہارنپور کی ایک خاتون تسنیم جو جدہ میں رہتی تھیں۔ انہوں نے سہارنپور میں فساد کی خبر سنتے ہی ٹیلی فون کیا کہ سہارنپور کے مسلمانوں کی حالت معلوم کریں۔ ان کا فون سبودھ شرما ایڈوکیٹ کے گھر پر

آیا(Ph-644752)۔ شرما صاحب کی بہن مس ایتا چوں کہ تسنیم صاحبہ کی کلاس فیلو تھیں اس لئے انہوں نے یہ فون ان کے یہاں کیا۔ ۱۹ اپریل کی ملاقات میں مسٹر سبودھ شرما ایڈوکیٹ نے بتایا کہ جب ہمارے گھر میں فون کی گھنٹی بجی اور میری بہن ایتا نے ریسیور اٹھایا اور فون پر کہا کہ ہلو تو اچانک فون کے دوسری طرف سے رونے کی آواز آنے لگی۔ مس ایتا نے کہا کہ کیوں رو رہی ہو۔ جدہ سے بولنے والی خاتون نے کہا "ہمیں تو یہ پتہ چلا تھا کہ چوک فوارہ کا علاقہ فساد میں مکمل طور سے نذر آتش ہو چکا ہے اور کسی کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ اپنی فرینڈ کو زندہ پاکر اور اس کی آواز فون پر سن کر اچنبھے میں تھیں اور دیر تک روتی اور سسکتی رہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہیں۔

۹ اپریل کی رات کا کھانا ڈاکٹر کوشل کے یہاں تھا۔ یہاں ڈاکٹر کوشل کے سوا مسٹر امین سیانی (آرٹسٹ) مسٹر دیش بھکت (سیاسی لیڈر) وغیرہ موجود تھے۔ حسب رواج لوگ میری پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگے۔ میں نے ہر ایک کو منع کیا۔ ہر ایک سے کہا کہ آپ لوگ کھایئے، میں بعد کو لے لوں گا۔ یہاں تک کہ سب لوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھانا کھانے لگے۔ میں نے کچھ دیر کے بعد ایک سادہ روٹی اپنی پلیٹ میں رکھی اور بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ میں چنے کے برابر روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا اور اس کو منہ میں ڈال کر چباتا رہتا۔ لوگ کھانا کھا چکے اور میری پلیٹ میں آدھی روٹی رہ گئی تھی۔ میں نے بچی ہوئی روٹی برادرم محمد اسلم کو اصرار کر کے دے دی۔ اس کے سوا میں نے دستر خوان پر کچھ بھی نہیں کھایا۔ وہاں سے لوٹ کر اسی طرح رات کو سو گیا۔ اگلے دن صبح کو کافی دیر کے بعد ڈاکٹر شاہد صابری (امیبہٹہ) کے یہاں ناشتہ کیا۔ دوبارہ یہ ہوا کہ میز پر پھیلے ہوئے بہت سے آئیٹم میں سے صرف ایک دو چیز کھائی۔ اور بقیہ کو چھوڑ دیا۔

دہلی واپسی کے بعد میں نے برادرم کوکب الباری سے ڈاکٹر کوشل کے یہاں پیش آنے والا روٹی کا قصہ بتایا۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جب میز یا دستر خوان پر طرح طرح کے پر تکلف کھانے ہوں تو ان کو دیکھ کر میرا

شہیہ(appetite) ختم ہو جاتا ہے۔ بھوک کی حالت میں بھی کھانے کی رغبت نہیں ہوتی۔ بس زبردستی کچھ کھالیتا ہوں۔ اس کے برعکس اگر سادہ کھانا ہو تو کھانے کا جی چاہتا ہے اور میں بھوک کے مطابق شوق سے کھانا کھاتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ایک بار میں جموں و کشمیر کے علاقہ میں گیا۔ ایک صاحب کے یہاں شام کے کھانے کی دعوت تھی۔ جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ میرے فین(Fan) ہیں۔ انہوں نے انتہائی لذیذ اور پر تکلف کھانے پکوائے۔ دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانوں کے ساتھ خالص شہد اور تازہ بادام ہرے چھلکوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مسرت کے انداز میں کہا کہ کل جب آپ یہاں سے جائیں گے تو ہم آپ کو شہد اور بادام کا تحفہ دیں گے۔

مگر دستر خوان پر پر تکلف اور خوشبودار کھانوں کو دیکھ کر وہی ہوا کہ میری رغبت ختم ہو گئی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ یہ لیجئے، وہ لیجئے۔ مگر میں کچھ کھا نہ سکا۔ میں نے صرف روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا اور کچھ شہد اور بادام۔ اس پر صاحب خانہ غصہ ہو گئے۔ شاید انہوں نے اس کو توہین سمجھا کہ ان کے تیار کئے ہوئے پر تکلف کھانے کو میں نے نہیں کھایا۔ ان کا غصہ اتنا بڑھا کہ اگلے دن جب میں ان کے یہاں سے واپس ہو کر دہلی کے لئے روانہ ہوا تو انہوں نے حسب وعدہ مجھ کو نہ شہد کا تحفہ دیا اور نہ تازہ بادام کا۔

جموں اور کشمیر کے اس سفر میں ایک اور بالکل برعکس واقعہ پیش آیا۔ ایک اسکول کے ماسٹر نے مجھے ناشتہ کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ میں صبح سویرے اسکول کے لئے بذریعہ بس روانہ ہو جاتا ہوں اس لئے آپ سویرے میرے گھر پر آجائیں تاکہ ہم آپ ایک ساتھ ناشتہ کر سکیں۔ میں نے کہا کہ میں صرف ایک شرط پر آؤں گا۔ وہ یہ کہ مجھے آپ وہی ناشتہ کرائیں جو آپ روزانہ کرتے ہیں۔ انہوں نے میری یہ شرط مان لی۔

صبح سویرے میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے دستر خوان بچھایا اور اس پر دو چیز رکھی ـــ سادہ روٹی اور اچار کا ایک ڈبہ۔ انہوں نے کہا کہ میں روزانہ یہی ناشتہ کرتا

ہوں۔ اچار سے روٹی کھاتا ہوں اور ایک پیالی چائے پی کر فوراً اسکول چلا جاتا ہوں۔ میں نے سادہ روٹی اور اچار کا یہ ناشتہ بہت شوق کے ساتھ کھایا۔ یہ سادہ کھانا کھا کر اس سے زیادہ خوشی ہوئی جو کھانے کے شوقین لوگوں کو پر تکلف دعوتوں میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کوشل کے یہاں کئی دوسرے لوگ بھی موجود تھے ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جو آرٹ کے میدان میں آل انڈیا شہرت رکھتے ہیں۔ ایک اور صاحب تھے جو سینئر پالی ٹیشین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان لوگوں سے کافی گفتگو ہوئی۔

میں نے محسوس کیا کہ آرٹسٹ لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف لائٹ سائڈ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو یہ خصوصی مہارت حاصل ہے کہ آپ سائنٹفک سوالات کا بھی پوئٹک جواب دے سکیں۔ یہی حال موجودہ زمانہ کے سیاست دانوں کا ہوتا ہے۔ وہ اس بات کی کافی مہارت رکھتے ہیں کہ وہ مثبت ایشوز کو بھی منفی رنگ میں بیان کر سکیں۔ ایسے لوگ ہر بات میں ایسا پہلو نکال لیتے ہیں جس کی زد حکمراں گروہ پر پڑتی ہو۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے کنڈیشنڈ ہو جاتا ہے اور کسی انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ وہ کنڈیشننگ کے اس ذہنی کہر سے باہر آجائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کم و بیش یہی کیس ہے۔ ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے کنڈیشنڈ تھنکنگ کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں دعوتی عمل کا آغاز براہ راست خطاب سے نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ کام کیا جائے جس کو تقریب ذہن کہا جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے حکمت کے ساتھ ذہن بنانا اور اس کے بعد براہ راست دعوتی خطاب کرنا۔ اسی حکیمانہ عمل کا نام اسلامی شریعت میں تالیف قلب ہے۔

۱۰ اپریل کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد ڈاکٹر اسلم صاحب کے مکان کی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ اس دوران کچھ لاؤڈ اسپیکر کی آواز سنائی دی۔ میں نے دھیان دیا تو لاؤڈ اسپیکر پر بولنے والا کہہ رہا تھا کہ: سورج نکلنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔

میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی کے پاس گھڑی ہے۔ ہر آدمی کو پتہ ہے کہ سورج نکلنے یا ڈوبنے میں کتنے منٹ باقی ہیں مگر ایک اور خبر ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ ہر آدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر کوئی یہ اعلان کرنے والا نہیں کہ تمہاری موت کے آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

۱۰ اپریل کی صبح کو ڈاکٹر شاہد صابری صاحب کے ساتھ امبہٹہ کے لئے روانگی ہوئی جو کہ سہارنپور سے ۲۵ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، امبہٹہ میں وہ پبلک اسکول دیکھا جس کو ڈاکٹر شاہد صابری نے لمبی کوشش کے بعد قائم کیا ہے۔

امبہٹہ میں ڈاکٹر شاہد صابری کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں وہاں کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ مختلف متعلق پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی گئی۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور زیادتی کا معاملہ کیا جاتا ہے ایسی حالت میں وہ یہاں کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ایک فرضی بات ہے۔ مسلمان بروقت ہی اس ملک میں زبردست ترقی کر رہے ہیں۔ اس ترقی کا نمونہ ہر بستی اور ہر شہر میں اس طرح دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کی موجودہ حالت کا تقابل ان کی ۱۹۴۷ کی حالت سے کیا جائے۔ ملک کی جس مسلم فیملی کا اس روشنی میں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مسلم فیملی ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے۔

یہ سلیکٹیو رپورٹنگ (selective reporting) کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ ہندستان میں ہر دن ہزاروں گاڑیاں دوڑتی ہیں۔ لیکن میڈیا میں کبھی ان کی خبر نہیں آتی۔ میڈیا کبھی یہ نہیں بتاتا کہ فلاں ٹرین فلاں اسٹیشن سے اپنے وقت پر روانہ ہوئی اور سیکڑوں میل کا سفر کر کے فلاں اسٹیشن پر خیریت کے ساتھ پہنچ گئی۔ اس قسم کے مثبت واقعات میڈیا میں کبھی رپورٹ نہیں ہوتے اس لئے لوگ غیر شعوری طور پر ان سے بے خبر رہتے ہیں۔ لوگ صرف ان بری خبروں کو جانتے ہیں جو میڈیا میں رپورٹ ہوتے ہیں اور تصویروں کے ذریعہ جن کو خوب نمایاں کیا جاتا ہے۔ یہی وہ

حادثاتی واقعات ہیں جو ریلوے کی دنیا میں کبھی کبھی اتفاقاً پیش آجاتے ہیں۔ان استثنائی واقعات کو پڑھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ ریلوں میں روزانہ حادثہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا نے یہ مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا کیا ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ کے اکثر فکری اور عملی مسائل براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی میڈیا کی پیداوار ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کی جو تصویر عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ میڈیا پر مبنی ہے اور میڈیا گویا سلیکٹیو رپورٹنگ کی ایک انڈسٹری ہے جو اچھی خبروں کو نظر انداز کرتی ہے اور صرف بری خبروں کو پیش کرتی ہے۔اس غلط تصویر کشی میں سب سے زیادہ دخل اردو اور ہندی اخباروں کا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات میں نے یہ کہی کہ موجودہ زمانہ میں صنعتی انقلاب کے بعد ایک قسم کا اقتصادی انفجار (eoonomic explosion) آیا ہے۔اس لئے آج کسی کے لئے بھی عام حالات میں اقتصادی محرومی کا سوال نہیں۔

ڈاکٹر شاہد صابری نے ہاروت وماروت کے بارے میں سوال کیا۔ جن کا قصہ قرآن (البقرہ ۱۰۲) میں آیا ہے۔ میں نے کہا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے۔بابل (عراق) کا مشرک بادشاہ فلسطین کے یہودیوں کو بڑی تعداد میں پکڑ کر بابل لے گیا اور وہاں وہ خدمت گار کے طور پر رہنے لگے۔اس زمانہ میں بابل میں جادو اور عملیات کا بہت زور تھا بڑے بڑے ساحر وہاں موجود تھے۔ان کے ساحرانہ کرشموں کو دیکھ کر یہودی بہت متاثر ہوتے تھے۔

جو لوگ سحر کے کرشمے دکھاتے ان کو وہ بزرگ اور صاحب کرامت سمجھ لیتے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہاروت وماروت کی صورت میں دو فرشتے بابل کی طرف بھیجے۔ وہ وہی ساحرانہ کرشمے زیادہ بڑے پیمانہ پر دکھا سکتے تھے جو بابل کے ماہر جادوگر دکھاتے تھے۔اس کے ساتھ

ہاروت وماروت یہ بھی کہتے کہ یہ محض فتنہ ہے اس کا بزرگی اور خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہاروت وماروت چونکہ خود بھی جادو جیسے بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے اس لئے ان کی زبان سے ان کرشموں کی نفی بیحد اہم تھی۔ عام آدمی اگر کہے کہ ساحرانہ شعبدے بے حقیقت ہیں تو لوگ اس کو وزن نہ دیں گے۔ مگر جو شخص خود بڑے بڑے ساحرانہ شعبدے دکھا رہا ہو جب وہ یہ کہے کہ یہ کوئی بزرگی اور کرامت کی چیز نہیں تو اس کے بعد لوگوں کے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ سب چیزیں چمتکار ہیں نہ کہ بزرگی یا خدا رسیدگی کی علامت۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے اس ملاقات کا ذکر کیا جو چند دن پہلے دہلی میں ہوئی تھی۔ یہ مسٹر مارک تلی (Mark Tully) کی ملاقات تھی۔ وہ ایک سینئر برٹش صحافی ہیں۔ وہ آج کل نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel. 4629687)

مسٹر مارک تلی ہندستانی مسلمانوں پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مجھ سے ملے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان آج پاکستان کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ اس پر انھیں تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جو میڈیا میں آتا ہے۔ اور میڈیا کا حال یہ ہے کہ وہ سلیکٹیو رپورٹنگ کی انڈسٹری ہے۔ یعنی بری خبروں کو چھاپنا اور اچھی خبروں کو چھوڑ دینا۔ میں نے بتایا کہ چند دن پہلے میں بی بی سی لندن کی نشریات کو سن رہا تھا۔ اناؤنسر نے ماریشس کے ایک ہندو کا خط پڑھ کر سنایا۔ اس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ آپ اپنے نیوز بلیٹین میں ماریشس کی خبریں نہیں دیتے۔ اناؤنسر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ماریشس میں سب گڈ نیوز ہوتی ہیں۔ اور جدید میڈیا کے اصول کے مطابق good news is no news۔ آپ لوگ کچھ بیڈ نیوز (bad news) فراہم کریں تو ہم ضرور ان کو نشر کریں گے۔

امبیٹہ سے واپس ہو کر سہارنپور پہنچا تو یہاں ڈاکٹر اسلم صاحب کے مکان پر بہت سے تعلیم یافتہ افراد منتظر تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان سے دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔

ایک مجلس میں آخرت اور جنت و دوزخ کا ذکر ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کہ جنت ہمارے عمل سے تو ملے گی نہیں۔ وہ تو اللہ جس کو چاہے گا دے گا۔ اس رائے کی تائید میں انہوں نے بعض آیتیں اور حدیثیں پیش کیں۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی میرا عمل جنت میں نہیں پہنچائے گا۔ الّا یہ کہ خدا اپنی رحمت اور اپنے فضل سے مجھے ڈھانک لے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کا عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جنت کی معیاری دنیا اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ عمل کی کوئی بھی مقدار اس کی قیمت نہیں بن سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کسی عمل کی قدر دانی کی بنا پر ملے گی نہ کہ اس عمل کی قیمت کے طور پر۔ قیامت میں خدا ہر ایک کے عمل کو جانچے گا۔ پھر جس آدمی کے عمل کو خالص اور قابل قدر پائے گا اس کی عزت افزائی اس طرح کرے گا کہ اس کے لئے جنت کا فیصلہ فرمادے گا۔

ایک مجلس میں تصوف پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حقیقی تصوف وہ ہے جس کو قرآن میں ربّانیت کہا گیا ہے۔ اس تصوف کا مطلب ہے، خارج سے بلند ہو کر داخل کا تجربہ کرنا۔ الفاظ سے گزر کر معانی تک پہنچ جانا۔ میں نے کہا کہ ایک صوفی کا قول ہے: انتم مع اورادکم ونحن مع وارداتنا۔ اس طرح کے اقوال کو کچھ ناقدین تصوف نے مطلق معنوں میں لے کر یہ سمجھ لیا کہ تصوف ظاہری عمل کی نفی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس طرح کے اقوال صرف ایک کے مقابلہ میں دوسرے پر زور دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگ اوراد یا ظاہری عمل ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ آدمی کا ظاہری عمل اس کے اندر واردات یا اعلیٰ کیفیات پیدا کرنے کا ذریعہ بن رہا ہو۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ جبری مادیت (compulsive materialism) کا زمانہ ہے۔ ہر آدمی مال کمانے کی طرف دوڑ رہا ہے تاکہ وہ سماج میں اعلیٰ اسٹیٹس کو حاصل کر سکے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ مال اور سامان کا ڈھیر لگانے کے بعد آخر کار آدمی محسوس کرتا

ہے کہ وہ ایک ناکام انسان ہے۔ کیوں کہ مال کا مقصد خوشی اور سکون تھا، اور وہ مال کے باوجود اس کو نہ مل سکا۔

اس تضاد پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اصل چیز مال نہیں ہے بلکہ اصل چیز مال سے انتفاع یا انجوائے کرنے کی استعداد ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو جو وجود ملا ہے وہ مختلف قسم کی محدودیتوں (limitations) کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ یہی محدودیتیں اس میں رکاوٹ ہیں کہ آدمی یہاں چیزوں سے انجوائے کرے۔ آخرت میں یہ محدودیتیں ختم کردی جائیں گی۔ اس وقت آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنی بھرپور استعداد (full capacity) کے ساتھ جی سکے۔ اور اسی قسم کی زندگی کا دوسرا نام خوشی اور سکون ہے۔

سہارنپور کے علاقہ میں بہت سے دینی مدرسے ہیں۔ ان میں سے دو زیادہ بڑے ہیں ــــــ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور۔ ان مدرسوں کے ذریعہ دینی تعلیم کی اشاعت کا کام بہت بڑے پیمانہ پر انجام پایا ہے۔

سہارنپور سے ایک اردو ماہنامہ آئینۂ مظاہر العلوم کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا شمارہ مارچ تا مئی ۲۰۰۰ نظر سے گذرا۔ اس میں "دینی مدارس کی اصلی غرض" کے عنوان سے مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مدارس کے علمی معیار کو بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ مدارس میں زیادہ اعلیٰ قابلیت کے افراد رکھے جائیں۔ اس تحریر کا ایک اقتباس یہ ہے:

"کوئی مدرسہ کھولنا ہو تو آج کل عادت یہ ہو گئی ہے کہ جو مدرسہ کی اصلی غرض ہے اس کی طرف تو لوگ نظر کرتے نہیں زوائد کو شروع کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے عمارت بنتی ہے اور وہ بھی ایسی ہوتی ہے کہ لوگ تماشہ کے لئے آیا کریں۔ روپیہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو اس میں خرچ ہو جاتا ہے اور جو اصل غرض تھی اس میں تخفیف کی جاتی ہے۔ اصل غرض تعلیم ہے۔ اس میں تخفیف یوں کی جاتی ہے کہ مدرسین بہت کم تنخواہ کے

ڈھونڈے جاتے ہیں۔ مدرس جتنا کم تنخواہ پر مل جائے اسی کو مہتمم اپنی کارگزاری سمجھتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ مدرسین کی تعداد بڑھالیں چاہے وہ فارغ التحصیل بھی نہ ہوں۔ بس تماشائیوں کو دکھلادیا کریں کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے مدرسین ہیں۔ صاحبو! اہل کمال تو کسی فن کے بھی سستے نہیں آتے۔ اچھا کاریگر، معمار مزدور کی اجرت پر نہیں آسکتا، اچھا دھوبی معمولی دھوبیوں سے دام زیادہ ہی لیتا ہے۔ پھر مدرس وہ کیسے اچھا ہوگا جو کم تنخواہ پر آجاوے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز میں تو آج کل ترقی ہے اور دین میں پست ہمتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں تو وہی چیز پسند کی جاتی ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور دین میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو بھی کافی سمجھ لیتے ہیں، افسوس آج کل حقیقت شناسی سے کس قدر بعد ہوگیا ہے۔" (صفحہ ۱۶)

ایک مجلس میں ایک صاحب نے آرٹ کے بارے میں سوال کیا۔ کیا اسلام میں آرٹ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً رقص، موسیقی، پینٹنگ، گانا وغیرہ۔ میں نے کہا کہ یہ چیزیں اسلام میں صراحۃً حرام نہیں کی گئی ہیں۔ مگر اسلام اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ خواہ حرام نہ ہو مگر اس کا ایک اور شدید نقصان ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ اس قسم کی چیزوں میں مشغول ہوتے ہیں وہ زندگی کے صرف لائٹ (light) سائڈ میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ زندگی کے زیادہ سنجیدہ (serious) سائڈ میں ان کی دلچسپی کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ بلاشبہہ کسی انسان کی حقیقی ترقی کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۱۰ اپریل کو دو بجے ہوٹل پنجاب کے وسیع ہال میں عام جلسہ ہوا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ جگہ نہ پانے کی بنا پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔ اس جلسہ میں جناب جسٹس شمیم صاحب اور مسٹر امین سیانی اور بعض دوسرے افراد کی تقریریں ہوئیں۔ مسٹر امین سیانی ریڈیو کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میل ملاپ کا پیغام دیا۔ جناب جسٹس شمیم صاحب مائنارٹی کمیشن کے چیرمین ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ

موجودہ حالت میں ہماری سب سے بڑی ضرورت نیشنل انٹگریشن ہے۔ جب تک نیشنل انٹگریشن نہ ہو کوئی بڑی ترقی ممکن نہ ہو گی۔

اس جلسہ میں مجھ کو تقریر کا جو عنوان دیا گیا تھا وہ اسلام اور سائنس تھا۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ سائنس اسلامی انقلاب ہی کی ایک پیداوار ہے۔ سائنس کیا ہے۔ سائنس حقائق فطرت کی دریافت پر مبنی ہے۔ فطرت (نیچر) اسلام سے پہلے پرستش کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا، اور شرک فطرت کی پرستش (نیچر ورشپ) کا دوسرا نام ہے۔ فطرت کی چیزوں کو قابل پرستش معبود سمجھ لینے کی وجہ سے فطرت کی تحقیق رکی ہوئی تھی۔ اسلام نے جب فطرت کو پرستش کے بجائے تسخیر کا موضوع بنایا تو اس کے بعد علوم فطرت ظہور میں آنا شروع ہوئے۔ اس طرح تاریخ میں سائنس کے دور کا آغاز ہوا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب اسلام دور جدید کا خالق)

ایک مجلس میں مسٹر امین سیانی (بمبئی) نے یہ سوال کیا کہ حب الوطنی من الایمان قرآن میں ہے یا حدیث میں۔ میں نے کہا کہ وہ نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ یہ دراصل ایک عربی مقولہ ہے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ عربی مقولہ فطرت پر مبنی ہے۔ وہ انسانی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ حب الوطنی من الایمان تو قرآن و حدیث میں نہیں۔ مگر معمولی فرق کے ساتھ وہ ہر آدمی کے سینہ کے اندر لکھا ہوا ہے اور وہ یہ ہے: حب الوطنی من الفطرۃ۔

میں نے کہا کہ قرآن میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں کہ اے ماؤ تم اپنے بیٹوں سے محبت کرو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماؤں کو اپنے بیٹوں سے محبت نہیں کرنا چاہئے۔ بیٹے کے لئے ماں کے دل میں محبت ہونا خود انسانی فطرت میں لکھا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو قرآن میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس کو قرآن میں درج نہیں کیا گیا۔ بلکہ فطرت انسانی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا گیا۔

یہاں ایک صاحب تھے جن کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن اور وید ایک ہی ہیں۔ انہوں نے اپنے

اس نظریہ کے حق میں قرآن کی ایک آیت پیش کی: وانه لفی زبر الاولین (الشعراء ۱۹۶) انہوں نے کہا کہ زبر الاولین آدی گرنتھوں کا لفظی ترجمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو جس کو آدی گرنتھ کہتے ہیں اس کی باتیں قرآن میں بھی آئی ہیں۔

یہ دلیل نہیں بلکہ لفظی تک بندی ہے۔ لفظی مشابہت سے کوئی بھی چیز ثابت نہیں ہوتی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہو تو ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں بھارت کے آدی باسیوں کا تذکرہ موجود ہے کیوں کہ قرآن میں آیا ہے کہ ـــــ فی شیع الاولین (الحجر ۱۰) اور شیع الاولین آدی باسی کا لفظی ترجمہ ہے۔

لفظی مشابہت سے استدلال کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ اس کے ذریعہ کچھ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کہا کہ انگریزی زبان کے تمام الفاظ اردو زبان سے لئے گئے ہیں۔ سننے والے نے کہا کہ وہ کیسے۔ کہنے والے نے کہا کہ آپ کوئی لفظ بتایئے اور میں ابھی اس کو ثابت کر دوں گا۔ سننے والے نے کہا کہ ڈیکوریشن (decoration) کس اردو لفظ سے لیا گیا ہے۔ کہنے والے نے فوراً کہا: دیکھو رے شان سے۔ اسی طرح کہنے والے نے کہا کہ انگریزی شاعری سب کی سب ہندستان سے امپورٹ کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت میں اس نے کہا کہ شیکسپیئر اصل میں ایک ہندستانی شاعر شیخ پیرو تھا جس کو انگریزوں نے انگریزی میں ڈھال کر شیکسپیئر بنا دیا۔

ایک مجلس میں اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان میں دو قسم کے مذہبی رجحان نہایت غلط ہیں۔ اور ان سے کسی کو کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔ ان میں سے ایک رجحان یہ ہے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے جس کا علمی مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً خدا کا تصور ہندوازم میں مانزم (monism) پر مبنی ہے اور اسلام میں مانوتھی ازم (monotheism) پر۔ ہندوازم میں خدائی اوتار کا تصور ہے اور اسلام میں پیغمبر کا تصور۔ ہندوازم میں پنر جنم کا عقیدہ ہے اور اسلام میں موت کے بعد ہی جزاء وسزا کا تصور، وغیرہ۔

اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان فرق

(difference) کا انکار کرنے کے بجائے علمی ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مذاہب کا احترام کرتے ہوئے لوگ آپس میں اسی طرح مذہبی موضوعات پر کلام کریں جس طرح سیکولر لوگوں کے درمیان سائنسی موضوعات پر کھلی بحث کی جاتی ہے۔ اور کوئی اس کو برا نہیں مانتا۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ سماجی ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب کی تعلیمات ایک ہیں۔ مگر بطور واقعہ یہ دعویٰ درست نہیں۔ مثال کے طور پر ہندو مذہب میں یہ عقیدہ ہے کہ آدمی موجودہ زندگی میں جو کرم کرتا ہے اس کو وہ دوبارہ اسی دنیا میں واپس آکر بھوگتا ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ جبکہ اسلام میں یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ زندگی میں آدمی جو عمل کرتا ہے اس کا انجام موت کے بعد ہی اس کے سامنے آجاتا ہے اور جنت یا جہنم کی صورت میں وہ اس کو پالیتا ہے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کا کوئی تعلق مذہبی یکسانیت سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک ہی مذہب کے ماننے والے آپس میں نہ لڑتے جب کہ باہم لڑائی کی مثالیں ہر مذہب کے ماننے والوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سماجی ہم آہنگی کے لئے زیادہ صحیح فارمولا یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق، ایک مذہب پر عمل کریں اور دوسرے مذہب کے پیروؤں کا احترام کریں:

Follow one, respect all

کئی اخباروں نے تفصیلی انٹرویو لینا چاہا مگر وقت کی کمی کی بنا پر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک ہندی اخبار راشٹریہ سوروپ کے دو نمائندے مسٹر ٹی ایم گاندھی اور مسٹر ونود پیشگی اپائنٹمنٹ کے بغیر میری قیام گاہ پر آگئے۔ انھوں نے مختلف ملکی اور ملی مسائل پر سوالات کئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ملک کا اصل مسئلہ تعلیم ہے۔ جب تک تعلیم میں قوم آگے نہیں بڑھے گی کوئی بھی ترقی نہیں ہو سکتی۔

۱۰ اپریل ۲۰۰۰ کی شام کو سہارنپور سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر دوبارہ شتابدی

اکسپریس کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ ٹرین جاتے ہوئے بھی ٹھیک ٹائم پر تھی اور واپسی میں بھی وہ اپنے ٹھیک ٹائم پر ۱۱ بجے رات کو دہلی پہنچ گئی۔

بہت دنوں سے ٹرین میں میرا کوئی سفر نہیں ہوا تھا اس لئے جب سہارنپور کا یہ سفر پیش آیا تو ذہن میں ایک موہوم سی تشویش پیدا ہو گئی۔ اس مدت میں مجھے ٹرینوں کا ذاتی تجربہ تو نہیں تھا لیکن میڈیا میں میں اس کی خبریں سنتا اور پڑھتا رہا۔ فلاں جگہ ٹرین پٹری سے اتر گئی، فلاں جگہ دو گاڑیاں آمنے سامنے سے ٹکرا گئیں، فلاں جگہ ریلوے کراسنگ پر ٹرین اور بس کی ٹکر ہو گئی۔ فلاں جگہ ٹرین میں آگ لگ گئی۔ اس قسم کی خبروں کی بنا پر ذہن میں ٹرین کی جو تصویر بنی تھی وہ بظاہر یہ تھی کہ ٹرین ایک ایسی سواری ہے جو اکثر حادثات کا شکار ہوتی رہتی ہے لیکن جب میں نے ٹرین کے ذریعہ سفر کیا تو میں خیریت کے ساتھ دہلی سے سہارنپور گیا اور سہارنپور سے دہلی واپس آ گیا۔

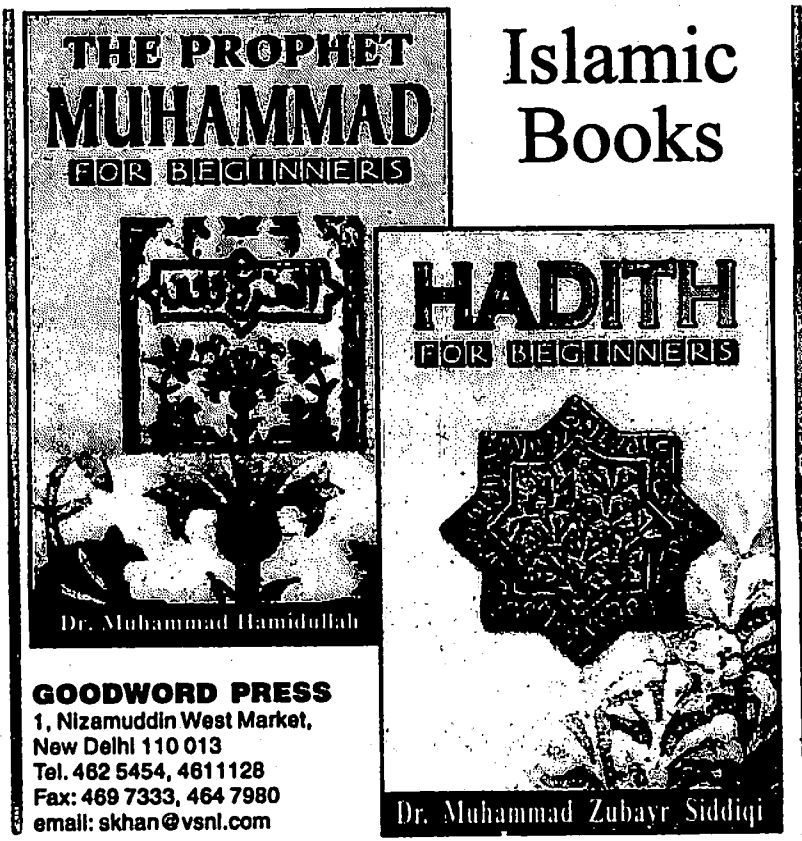

سوال

کیا مادیت اپنے زوال کے بعد از سر نو عروج کو پہنچے گی؟ کیا جدید مادیت کا زوال ہو رہا ہے؟ اگر زوال ہو رہا ہے تو اس کی علامتیں کیا ہیں اور اگر اس کا زوال نہیں ہو رہا ہے تو آئندہ کب اس کا زوال ہو گا۔ کیوں کہ فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ: ہر کمالے را زوال (طارق اشفاق، علیگڈھ)

جواب

مٹیریلزم کے دو مطلب ہیں۔ فلسفیانہ معنوں میں مٹیریلیزم خدائی مذہب کے بالمقابل ایک اور مذہب کی حیثیت رکھتا ہے جو صرف مادہ کو واحد حقیقت مانتا ہے۔

> In phliosophy, the doctrine that matter is the only reality and that everything in the world, including thought, will, and feeling, can be explained only in the terms of matter. (Webster's, p.1110)

مٹیریلزم اس مفہوم میں عملاً اب ختم ہو چکا ہے۔ جدید سائنس نے میٹر کے اس تصور کو مکمل طور پر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے جس کے اوپر مادی فلسفہ کا نظریہ قائم تھا۔ مٹیریلزم کے لئے اب کوئی نظریاتی بنیاد نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب، "مذہب اور سائنس"۔

مٹیریلزم کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو عملی طور پر لوگوں کے اندر قائم ہے یعنی مادی خوشی یا مادی فائدے کو سب کچھ سمجھنا۔ مادی ترقی کو زندگی کا مقصد قرار دینا۔ اس دوسرے مفہوم میں مٹیریلزم ہر دور میں تھی اور آج بھی وہ پوری طرح زندہ ہے۔ بیشتر لوگ اس کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اس دوسرے مفہوم میں مٹیریلزم کبھی مرنے والا نہیں۔ وقتی لذت یا وقتی خوشی کا فریب اتنا زیادہ پرکشش ہے کہ آدمی کبھی اس کے سحر سے نجات نہیں پائے گا۔ اس لئے وہ کبھی اس مفہوم میں مٹیریلزم کو نہیں چھوڑے گا۔

جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے، وہ میرے نزدیک مستقل بالذات کوئی چیز نہیں۔ انسانوں کی مادیت پسندی اجتماعی صورت اختیار کر کے تہذیب بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک تاریخ کی ہر تہذیب بنیادی طور پر مادی تہذیب ہی تھی اس لئے اگر ایک مادی تہذیب مٹے تو عملاً

صرف یہ ہوگا کہ اس کی جگہ دوسری مادی تہذیب غالب آجائے گی۔ اس دنیا میں فرد کی حیثیت سے غیر مادی انسان کا وجود تو ممکن ہے مگر اجتماعی معنوں میں کسی ایسی انسانی تہذیب کا قائم ہونا شاید ممکن نہیں جو مجموعی معنوں میں غیر مادی اصولوں پر قائم ہو۔

سوال

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارے میں سنجیدہ لوگ عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی سوچ کے اعتبار سے جذباتی ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر حقیقت پسندانہ مزاج موجود نہیں۔ جب کہ کسی بھی ترقی کے لئے غیر جذباتی سوچ اور حقیقت پسندانہ مزاج لازمی طور پر ضروری ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا یہ مزاج کیسے بنا اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔
(ڈاکٹر کے۔ عبد الستار، مدراس)

جواب

میرے نزدیک اس غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا آغاز زیادہ نمایاں طور پر انیسویں صدی میں ہوا۔ اس زمانہ میں مغربی قومیں مسلم علاقوں میں داخل ہو گئیں، انھوں نے تقریباً ہر جگہ براہ راست یا بالواسطہ انداز میں سیاسی اور تہذیبی طور پر غلبہ حاصل کر لیا۔

یہ وقت معاملہ کی تشخیص کا تھا۔ بد قسمتی سے اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے معاملہ کی غلط تشخیص کر کے مسلمانوں کی سوچ کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ ان حضرات نے مسلمانوں کو بتایا کہ اس واقعہ کے پیچھے تمام تر مغربی قوموں کی سازش اور ان کی دشمنی ہے۔ جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ مسلمان اب اپنے دور زوال میں پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف مغربی قومیں تازہ دم قوتوں سے مسلح ہو کر آرہی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ قانون فطرت کے تحت ہوا وہ عین وہی تھا جو مقابلہ کی اس دنیا میں ہمیشہ پیش آتا ہے۔

اس وقت مسلم رہنماؤں کو چاہئے تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ قانون فطرت کے تحت ہوا ہے اور وہ خود تمہاری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے تو مسلمانوں

میں تعمیر خویش کا جذبہ جاگ اٹھتا مگر جب انہوں نے اس معاملہ کو اغیار کی سازش اور دشمنی کا نتیجہ قرار دیا تو مسلمانوں میں غیر قوم کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورا مسلم معاشرہ منفی سوچ کا شکار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو آپ نے جذباتی سوچ کا نام دیا ہے۔

اس طرح تقریباً دو سو سال پہلے مسلمانوں کے اندر جذباتی طرز فکر شروع ہوا۔ وہ بڑھتے بڑھتے پوری مسلم ملت پر چھا گیا۔ اب ضرورت ہے کہ اس جذباتی طرز فکر کو توڑا جائے اور لوگوں میں حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔ مگر یہ کام ایک بھاری قربانی چاہتا ہے۔ اور وہ قربانی شخصی مقبولیت کی قربانی ہے۔ جو آدمی اس مزاج کو ختم کرنے کے لئے اٹھے گا یقینی طور پر وہ مسلمانوں میں غیر مقبول ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے فہیم حضرات مصلحت کا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مزاج کو توڑنے کی بجائے اس کو وہ غذا دے رہے ہیں جو اس کو پسند ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر غیر مقبول ہونے سے بچائیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنی مقبولیت کی موت کے اوپر مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد رکھ سکے۔ جو مسلمانوں کی جذباتیت کو ختم کر کے ان کو حقیقت پسند بنائے، جو آدمی جذباتی تسلسل کو توڑنے کی کوشش کرے گا، ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی پہلی نسل میں غیر مقبول ہو جائے مگر یہی وہ حوصلہ مند شخص ہے جو اپنی ذاتی قربانی کی بنیاد پر ملت کے مستقبل کی تعمیر کرے گا۔ تاریخ کو ایسے ہی ایک بہادر انسان کا انتظار ہے۔

سوال

الرسالہ جنوری ۲۰۰۰ میں ایک مضمون "مستقبل کی قیادت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ: "ملک کے uper cast (ہندو) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے اس میں اونچی ذات والوں کے لئے تو باعزت جگہ ہے، مگر نیچی ذات اور غریب عوام کے لئے اس میں کوئی باعزت جگہ نہیں۔" مگر مسلمانوں میں بھی اسی طرح کی تفریق و کمزوری ہے، وہ کس آئیڈیالوجی یا سسٹم کے تحت ہے اس گمبھیر معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (انوار الحق، شیخ پورہ)

جواب

برادران وطن کے اندر اونچی ذات اور نیچی ذات کی جو تقسیم ہے وہ ان کے مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہے، اس کو ورن آشرم کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف خود ہندوؤں کے بڑے بڑے اہل علم نے کیا ہے، مثال کے طور پر دادا صاحب کالیلکر۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں آج جو تفریق نظر آتی ہے وہ ایک عملی تفریق ہے۔ وہ مسلمانوں کے اپنے قومی تنزل کے سبب سے وجود میں آئی ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے نہ کہ اسلام پر۔ مسلمانوں کی موجودہ تفریق کو مسلمانوں کی اصلاح کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے مگر برادران وطن کے درمیان جو تفریق ہے وہ اس وقت ختم ہوگی جب کہ خود ان کے مذہب میں ریفارم لایا جائے۔

سوال

میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میرے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا ہے کہ میں دعوت کا کام کروں۔ میری آرزو ہے کہ اپنی ڈگری لینے کے بعد میں کسی ایسے جامعہ میں داخل ہو جاؤں جو اس دور کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو۔ اور لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بناتا ہو۔ (محمد سعید۔ پاکستان)

جواب

دعوت کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کا جذبہ بے حد قیمتی ہے۔ مگر پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک میں تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو ایک آدمی کو داعی کامل بنائے۔ داعی خود اپنی کوششوں سے بنتا ہے نہ کہ کسی ادارہ کی تعلیم و تربیت سے۔

پاکستان میں دعوتی کام کے عظیم مواقع موجود تھے مگر وہاں کے اسلام پسند رہنماؤں کی ایک غلط فکر نے سارے امکان کو تباہ کر دیا۔ وہ فکر یہ کہ اسلامی دعوت کا کام اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ اس غلط سوچ نے پاکستان کی اسلامی تحریک کو عملاً سیاسی تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔ بہترین مواقع کے ہوتے ہوئے وہ کوئی مثبت دعوتی کام نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام اسلامائزیشن آف مین تھا مگر ان لوگوں نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ نہ صرف ایک غیر اسلامی نشانہ تھا بلکہ وہ اللہ کی ناقدری بھی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور میڈیا اور کمیونی کیشن اور انٹرنٹ نے دعوت کے مواقع کو ہزاروں گنا زیادہ وسیع پیمانہ پر ہمارے لئے کھول دیا ہے۔ ایسے دور میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا صرف ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی ناقدری ہے۔ اللہ نے کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع کھول کر ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کے پیغام کو ساری دنیا تک پہنچا سکیں۔ پیغام رسانی کے اس کام میں آج کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا گویا اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سیاست ایک ایسا جرم ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ مواقع کو تباہ کرنا اور تخریبی نشانوں پر قوم کو دوڑانا ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔

آپ جیسے نوجوانوں کو میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے حالات کے اعتبار سے دعوت کا کام شروع کر دیں۔ آپ کا دعوتی کام ہی آپ کے لئے وہ تربیت گاہ بن جائے گا جہاں آپ کو فطری عمل کے دوران دعوتی تربیت ملتی رہے۔ دعوت ہمیشہ حقیقی تجربہ کے دوران سیکھی جاتی ہے نہ کہ کسی رسمی کورس کے ذریعہ۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ (البقرہ ۲۸۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا اصل سرچشمہ تقویٰ ہے۔ آدمی کا اخلاص اور اس کا خوف خدا، دیانتداری اور شفقت علی الخلق اور مسئولیت کا احساس، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کے لئے علم و آگہی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔

تقویٰ کا تعلق علم سے یہ ہے کہ تقویٰ آدمی کے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کو زیادہ گہرے غور و فکر کے قابل بنا دیتا ہے۔

۱ مدرسہ صدیقیہ (ضلع چمپارن) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ یہ سفر ۲۵ مئی سے ۲۷ مئی ۲۰۰۰ تک جاری رہا۔ اس دوران بہار کے مختلف مقامات پر دعوتی پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔ اس سفر کا ایک تجربہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اب ہر جگہ ایک نئی اور تعمیری سوچ ابھر رہی ہے۔ یہ تعمیری سوچ زیادہ تر الرسالہ مشن کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ کی براہ راست کوشش کے علاوہ جن لوگوں نے الرسالہ کی مخالفت کی ان کا بھی اس میں بالواسطہ انداز میں حصہ ہے۔ انھوں نے مخالفت کر کے لوگوں کو بتایا کہ حالات سے مقابلہ کرنے کا ایک اور طریقہ ہے جس کو الرسالہ پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ جب پچھلے طریقے فیل ہوگئے تو اب لوگ الرسالہ کے طریقہ کو استعمال کر رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں۔

۲ آواز جرس (آکولہ) کے نمائندہ جناب سید اسحاق راہی نے ۲۹ مئی ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دینی تعلیم کے ساتھ سیکولر ایجوکیشن بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر ملت کی مجموعی ترقی نہیں ہو سکتی۔ دینی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو صحیح شعور اور صحیح نظریۂ حیات دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں سیکولر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے زمانہ سے واقف ہو۔ وہ اس قابل ہو سکے کہ عصری تقاضوں کے مطابق زندگی کی تعمیر کر سکے۔ اسی کے ساتھ خود اسلام کی خدمت اور اشاعت کے لئے عصری علوم سے واقفیت ضروری ہے۔

۳ ایس آئی او کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ان کے ایک آل انڈیا پروگرام (نئی دہلی) میں ۶ جون ۲۰۰۰ کو شرکت کی۔ اور وہاں طلبہ کے اجتماع میں مفصل خطاب کیا، خطاب کا عنوان تھا: ہندستان میں مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہو۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن کے مطابق اس

دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے۔ یعنی پرابلم کے ساتھ سلوشن۔ اگر کبھی مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ہم جو فار مولا استعمال کر رہے ہیں وہ صورت حال کے مطابق نہیں۔ ایسی حالت میں نئے فار مولے کا استعمال کرنا چاہئے۔ یہی سنت رسول ہے۔ جہاں جنگ کا فار مولا کار آمد نہ ہو رہا ہو وہاں امن کا فار مولا استعمال کرنا چاہئے۔ جہاں براہ راست مقابلہ موثر نہ ہو رہا ہو وہاں بالواسطہ مقابلہ کرنا چاہئے، وغیرہ۔

۴ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات خدا کے فضل سے ساری دنیا میں پہنچ رہی ہیں۔ اب یہ مطبوعات براہ راست مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک اکثر ملکوں کے بک سیلر انگریزی مطبوعات منگوا رہے ہیں اور اپنے نظام کے تحت ان کو پھیلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ویب سائٹ اور انٹرنٹ کی ذریعہ مستقل طور پر اسلامی مرکز کا دعوتی پیغام عالمی سطح پر پہنچ رہا ہے۔ فالحمد لله على ذالك۔ اطلاعات کے مطابق، لوگ ان کتابوں اور مضامین کو وقت کے اعلیٰ معیار کے مطابق پا رہے ہیں اور بڑی تعداد میں اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

۵ انٹرنٹ کے ذریعہ مسلسل طور پر دنیا بھر میں لوگوں سے دعوتی روابط جاری ہیں۔ لوگ اپنے سوالات اور تاثرات بھیجتے ہیں جن کا جواب دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انٹرنٹ کے ذریعہ ملے ہوئے ایک خط کا کچھ حصہ یہ ہے:

Salaam.

I have recieved an article from your organization and I thought it was most informative...it was sent by a friend.... please can you forward me more...

jazakallah

Faheema Khan, South Africa.

۶ ایک نئی انگریزی کتاب *Islam Re-discovered* کے نام سے تیار ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی۔ یہ کتاب فی الحال انگریزی زبان میں ہے۔ اس میں اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کو عصری اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

۷ روزنامہ قومی آواز (نئی دہلی) کے شمارہ ۱۴ جون ۲۰۰۰ میں اس کے "مراسلات" کے کالم میں ایک مراسلہ چھپا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ ساز ہستی"۔ یہ مراسلہ قومی آواز کے کالم سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت ان کے علمی و دینی کاموں کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ آج کے اس پر فتن دور میں جب کہ قبروں کی تجارت سے لے کر مساجد و مدارس کی تجارت اور نوع بنوع تنظیموں کی بھرمار بام عروج پر ہے جس سے مسلمانوں پر ایسے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ وہ قوت فکر سے عاری اور حق و باطل کی تمیز سے کوسوں دور ہیں۔ اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اسلام کی آفاقیت رہبانیت کی شکل اختیار کر گئی ہے اور بد قسمتی سے ایک محدود ذہنیت کے لوگ اسلام کی تصویر مسخ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت نے مسلمانوں کو نئی زندگی اور صحیح انداز فکر کی دعوت دی ہے۔ وہ ایسے واحد مسلم مفکر ہیں جو بے لوث و بے غرض اور منفعت خوری سے ہٹ کر مسلمانوں کے تئیں مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں مسلمانوں کو بے جا جذباتیت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں کیوں کہ بے جا جذباتیت سے ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ ان کے گرانقدر مشوروں اور نصیحتوں کو سمجھتا ہے اور انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی پوری زندگی قرآنی علوم و احادیث نبویہ و تواریخ قدیم و جدید کے گہرے مطالعہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے ان کا ایک ایک لفظ جادو سے زیادہ موثر اور سونے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ ماہنامہ "الرسالہ" ایک زندہ و تابندہ شہادت ہے۔ یوں تو ہر دور میں منافقت و تشدد کا دور دورہ رہا ہے لیکن عصر حاضر میں یہ وبا کچھ اور عام سی ہو گئی ہے۔ وقت کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ جب جب لوگوں نے اپنے اپنے دور میں صدائے حق اور علم اور عرفان بلند کی ہے۔ ایک علم و آگہی سے کورا اور غبی طبقہ ان کا مخالف ہو گیا ہے کیوں کہ یہ طبقہ ان بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے جنہیں قدرت نے اشرف المخلوقات

جیسی عقل و خرد سے ہمکنار نہیں کیا۔

تاریخ کے صفحات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی مذہب میں چاہے وہ عیسائی دھرم ہو یا اسلام جیسا صاف ستھرا آفاقی مذہب ہو جب بھی اس کی صفوں میں جوگیوں راہبوں کی کثرت ہونے لگی ہے، قدرت نے ان کے اندر ایک مصلح بھیجا ہے جس نے انشراح صدر کے ساتھ تمام مظالم کا سامنا کیا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آیا ہے کہ اس کی بے پناہ زمینی حقیقت کے سامنے بڑے بڑے پادریوں جوگیوں اور رہبانیت کی تعلیم دینے والے اماموں کی ہوا اکھڑ گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سب کچھ ایک طویل مدت میں سرانجام پاتا ہے اگر ایک طرف اسلام کا آغاز قرآنی آیات کی قرأت ہے تو دوسری طرف کفار اور حاسدین کی پوری کوشش ہے کہ قرآن کی آواز کسی دوسرے کان تک نہ پہنچ سکے اور یہی واقعہ عصر اسلام سے عصر جدید تک دہرایا جارہا ہے۔

مولانا کا "علم جدید کا چیلنج" ان کے معترضین کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے جس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ مولانا کے مداحوں اور ان کے موقف کی تائید کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے وہیں ان کی معترضین بغلیں جھانک رہے ہیں کیوں کہ انہیں تعلیم یافتہ طبقہ کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب ایک مخصوص گراؤنڈ کے لوگ ہیں جنہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ مسلمانوں کی کیا حالت ہے اور ان کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ موجودہ مشکلات کے اسباب کیا ہیں اور ان سے کیوں کر نمٹا جا سکتا ہے۔ ہم جے این یو (J.N.U.) کے طلباء مولانا کا بہت احترام کرتے ہیں کیوں کہ ان کی ہستی پوری امت اسلامیہ کے لیے مایہ افتخار ہے"۔ (عمیر احمد ندوی، ایم اے عربک، جواہر لال نہرو یونیورسٹی)

۸ انگریزی میں ایک کتاب اسلام ری ڈسکورڈ (Islam Rediscovered) کے نام سے تیار ہوئی ہے اور اس وقت زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ اسلام کے مختلف فکری اور عملی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ پوری کتاب جدید سائنسی اسلوب میں ہے۔

دینی مدارس

اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب

از : مولانا وحید الدین خاں

دینی مدارس کے عنوان پر ایک مفصل مقالہ تیار ہوا ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ انشاء اللہ الرسالہ ماہ ستمبر ۲۰۰۰ میں اس کے خصوصی شمارہ کے طور پر شائع ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ مقالہ دینی مدارس کے نام سے علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو رہا ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۲۵ روپیہ ہے۔ زیادہ تعداد میں خریدنے کی صورت میں خصوصی رعایت دی جائے گی۔

اس کتاب میں تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ علم کی اہمیت کیا ہے۔ اسلام میں علم کو کتنا بڑا مقام دیا گیا ہے۔ "مدرسہ" کی تحریک نے کس طرح عظیم کارنامے انجام دئے ہیں۔ دینی مدرسے اس ملک کے لئے خطرہ نہیں۔ وہ ملک کے لئے ایک اثاثہ اور نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدرسے نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے ایک نعمت ہیں۔

تفصیلات کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

ISLAMIC BOOKS

Tell Me About Hajj *(with colour pictures)*	295/-
Tell Me About the Prophet Muhammad *(with colour pictures)*	345/-
Allah is Known Through Reason *(with colour pictures)*	345/-
The Miracle in the Ants *(with colour pictures)*	295/-
The Quran	295/-
The Quran: An Abiding Wonder	145/-
The Call of the Qur'an	95/-
The Koran	195/-
Heart of the Koran	195/-
The Soul of the Quran	145/-
Presenting the Quran	125/-
The Moral Values of the Quran	125/-
The Basic Concepts in the Quran	195/-
A Treasury of the Quran	75/-
The Quran for all Humanity	75/-
The Beautiful Commands of Allah	125/-
The Beautiful Promises of Allah	175/-
The Wonderful Universe of Allah	85/-
Muhammad: A Prophet for all Humanity	195/-
Muhammad: A Mercy to all the Nations	250/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
The Sayings of Muhammad	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-
Muhammad: The Hero as Prophet	75/-
History of the Prophet Muhammad	75/-
An Islamic Treasury of Virtues	195/-
A-Z Steps to Leadership	95/-
Islam and Peace	150/-
Introducing Islam	195/-
The Moral Vision	145/-
Principles of Islam	145/-
The Muslim Prayer Encyclopaedia	295/-
After Death, Life!	195/-
Living Islam: Treading the Path of Ideal	250/-
A Basic Dictionary of Islam	250/-
The Muslim Marriage Guide	250/-
The Essential Arabic	175/-
Indian Muslims	65/-
God Arises	125/-
Islam: The Voice of Human Nature	40/-
Islam: Creator of the Modern Age	70/-
Woman Between Islam and Western Society	145/-
Woman in Islamic Shari'ah	125/-
Islam As It Is	70/-
Religion And Science	45/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	40/-
Polygamy and Islam	7/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
The Way to Find God	25/-
The Teachings of Islam	50/-
The Good Life	45/-
The Garden of Paradise	45/-
The Fire of Hell	45/-
Islam and the Modern Man	25/-
Uniform Civil Code	10/-

Goodword
B·O·O·K·S

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com

ISLAMIC BOOKS

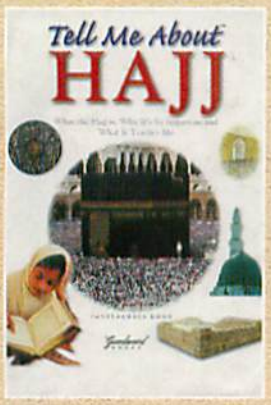

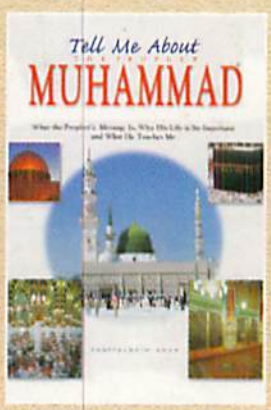

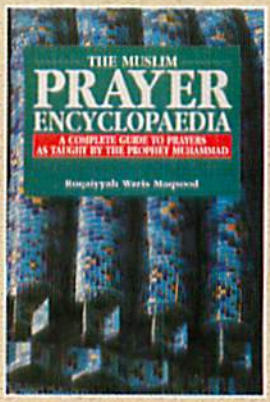

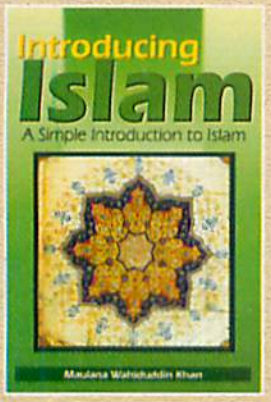

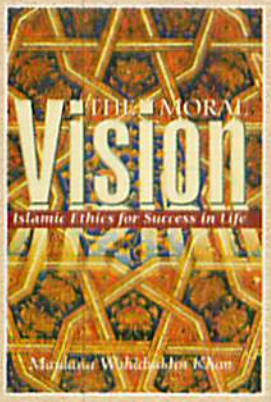

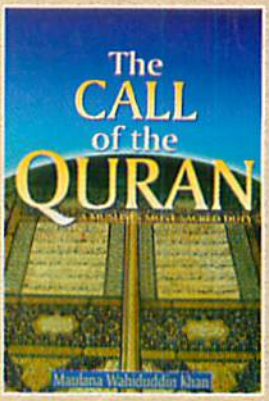

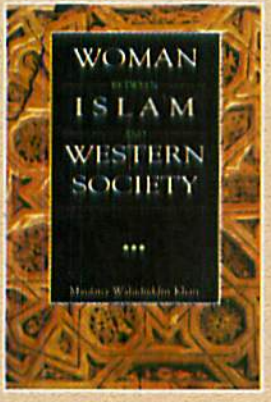

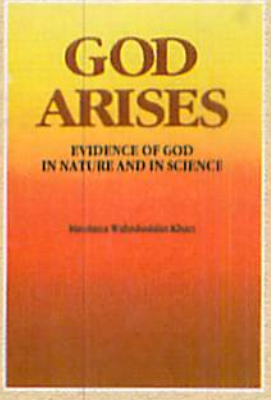

GOODWORD PRESS

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, Fax: 469 7333
email: skhan@vsnl.com

Delhi Postal Regd. No. DL-11194/2000